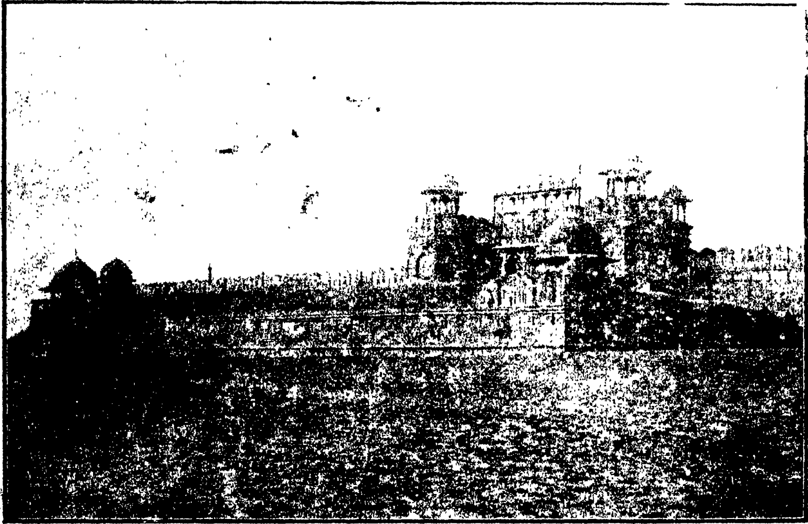
جلد اوّل　　بابت جنوری ۱۹۲۱ء　　حصّہ اوّل

اُردو



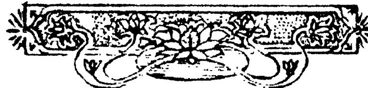
انجمنِ ترقی اُردو

کا

سہ ماہی رسالہ

(باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ سے چھپکر شائع ہوا)

		مضمون نگار	صفحه
۱	فر وسی کا مذہب	محمود خاں صاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور	۱
	سا زی اور پریاں	مولانا مولوی محمد عبدالعلیم صاحب شرر	۷۱
۲	جو ن	ابوالمعالی حضرت اختر شیرانی صاحب	۸۳
۴	وزن رباعی پر ایک نوٹ	مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے	۸۹
۵	ر ں جدید ئے اردو	مولوی عبدالرحمن خاں صاحب اسسٹنٹ امپیریل اکاؤنٹ بوٹے نست پوسہ	۹۷
	بارہ اصلاح خلش سی ایک چیز سی جس میں مزا بھی آتا ہے	مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے	۱۲۱
۷	تبصرے	مولوی عبدالحق صاحب بی اے اڈیٹر	۱۲۵



فہرستِ مضامین

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
آغاز	مولوی عبدالحق صاحب آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو	۱
محاسن کلام غالب (اُردو)	ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم	۹
علمی مصطلحات دیسی زبانوں میں	نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین صاحب بلگرامی) سی ایس آئی	۶۵
اُصول وضع مصطلحات	....	۹۲
قدیم یونانی علم ادب	مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ	۹۳
مقدمۂ نکات الشعرا	مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی سرکار عالی	۱۰۳
تجویز بقائے اُردو	مولوی سید غلام بھیک صاحب نیرنگ بی اے ایل ایل بی	۱۲۳
تجویز در بارۂ اصلاح رسم الخط	عبداللہ یوسف علی صاحب - سی بی ای - ایم اے - ایل ایل بی	۱۲۰
مصنفین و شعرائے تیموریہ	"مترجم"	۱۳۳
اصطلاحات علمیہ	مولوی عبدالحق صاحب - آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو	۱۵۱
جامعۂ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)	"معلم"	۱۶۳
مختصر ششماہی رپورٹ انجمن	اسسٹنٹ سکرٹری صاحب - انجمن ترقی اُردو	۱۶۳
گوشوارۂ جمع خرچ انجمن		۱۸۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنقید ۱۹۵۵

آغاز

ابتدا سے انجمنِ ترقی اُردو کے مقاصد میں یہ داخل ہی کہ اس کی طرف سے ایک رسالہ شایع کیا جائے۔ لیکن سرمایہ کی قلت اور حالات کی ناساعدت کی وجہ سے یہ ضروری مقصد اب تک عمل میں نہ آیا۔ اب حالات اور واقعات بہت کچھ بدل چکے ہیں، انجمن کی حیثیت بھی وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اور اگرچہ اس کا سرمایہ ایسا نہ ہو جس پر ہم فخر کرسکیں مگر ایک حد تک قابلِ اطمینان ضرور ہی اور گو اس کے ارکان کی تعداد، جیسا کہ ہماری خواہش ہی، ہزار دل تک نہ پہونچی ہو تاہم اس کے سرپرستوں اور حامیوں کی ایک مختصر جماعت ایسی ہی جو اس کی ترقی کی خواہاں اور اس کی اعانت کے لیئے دل سے آمادہ رہتی ہی۔ علاوہ اس کے اقتضائے وقت ایک ایسی چیز ہی جس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہی اور جسے وقت پر نہ سمجھنے سے ہمیشہ پچھتانا پڑتا ہی۔ اِس کے بعد تامل کرنا یا کسی بہتر زمانہ کا انتظار کرنا قابلِ الزام ہوگا۔ اِس لیئے بعد غور اور مشورہ کے یہ قرار پایا کہ اس سال جس طرح بن سکے انجمن کا رسالہ ضرور شایع ہو جانا چاہیئے۔

اب سوال یہ ہی کہ یہ رسالہ کیسا ہو؟ معاً اس سوال کے جواب میں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہی، کیا اِس کی تشریح کی ضرورت ہی؟ انجمن کا مقصد ظاہر ہی اور اس کا رسالہ اس کے مقصد کے تابع ہوگا۔ اِس لیئے بظاہر

کسی تشریح یا توضیح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس بارے میں جب بعض احباب سے گفتگو آئی تو معلوم ہوا کہ اس کے سمجھنے میں کچھ اُلجھن پیدا ہوتی ہے اور کیا عجب ہے کہ ہمارے بعض ناظرین کو بھی اردو زبان کے موجودہ رسالوں پر قیاس کرنے سے مغالطہ ہو، لہٰذا اس رسالہ کی خصوصیت کے متعلق مختصراً کچھ لکھ دینا مناسب ہوگا۔

سب سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ رسالہ خالص ادبی ہوگا۔ یہ مثل کشکول کے نہ ہوگا جس میں ہر قسم کی رطب و یابس اور رائل بے جوڑ مضامین بھر دیئے جاتے ہیں اور کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا۔ صرف پیشانی پر اس قدر لکھ دینا کافی ہے "ادبی، اخلاقی، تاریخی، معاشی، سیاسی رسالہ"، میں نے یہ تعریضاً نہیں کہا، ملک کو ایسے رسالوں کی بھی ضرورت ہے۔ مگر انجمن کا رسالہ ادب اور اس کے متعلقات کی حد سے آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔

اس پر اکثر صاحبوں نے اعتراض کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ کاغذ کی یہ ناؤ کب تک چلیگی اور یہ مضمون کب تک مساعدت کریگا۔ بہت ہوا تو دو سال چلیگا۔ اور آخر یہ دفتر تہ کرنا پڑیگا۔

میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان صاحبوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا اور ردش عام اس رائے کا باعث ہوئی ہے۔ اگر ذرا نظرِ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ میدان باوجود تنگی کے بہت کچھ وسعت رکھتا ہے اور بجائے خود ایک عالم ہے۔ قلم کا مسافر آبلہ پا نہو تو یہاں وہ وہ منظر نظر آئینگے جن کے لطف اُٹھانے اور بیان کرنے کو ایک عمر چاہیئے۔ نظر کوتاہی نہ کرے تو بہت سے ایسے خزانے ہیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں اور جنھیں ہوا تک نہیں لگی۔ ہمت جی نہ چرائے تو بہت سی کانیں ہیں جو ابھی کھودنی ہیں۔

کون انکار کرسکتا ہے کہ بہت سے الفاظ اور محاورے ابھی تحقیق طلب ہیں۔

بہت سے ایسے مصنف اور شاعر ہیں جن کا کلام ابھی تک بساطِ قدردانی تک نہیں پہونچا۔

بہت سی کتابیں ہیں جو لکھنے کے بعد ہی گوشۂ گمنامی میں رہ گئیں یا شایع ہوتے ہی ناپید ہوگئیں۔

زبان کے رسم الخط، املا اور رانث میں بہت سی باتیں اصلاح طلب اور مشورہ اور بحث کی محتاج ہیں۔

اُردو کی تاریخ اور اس کی نشو و نما میں بہت سی منزلیں ابھی طے کرنی باقی ہیں۔

شاہراہِ زبان سے مختلف شاخیں ایسی پھوٹتی ہیں جن کا سراغ لگانا ضروری ہے۔ مثلاً خود اردو اور اس کی بہنیں کس خاندان کی ہیں ان میں باہم کیا تفاوت اور تعلق ہے اور ملک میں اُن کا کیا درجہ ہے۔

زبان کی ترقی و اشاعت کی بہت سی ایسی تجویزیں ہیں جو ابھی تک عالم خیال سے صفحۂ قرطاس پر نہیں آئیں۔ اُن پر بحث کرنا، اُن کا جانچنا اور اُن کو عمل میں لانا بھی بڑا کام ہے۔

تنقید جو ادب کی جان اور ذوق سلیم کی روح و رواں ہے ابھی ہمارے یہاں ابتدائی مرحلہ میں ہے اُسے صحیح رنگ میں دکھانا بہت بڑا فرض ہے۔ اس کے بغیر ادب کی خدمت ادا ہونی ممکن نہیں۔

اُردو کے بہت سے ایسے محسن ہیں جن کے حالات اور کارنامے ملک کے سامنے پیش ہونے چاہئیں اور خاصکر جو خدمت اُنھوں نے اُردو کی کی ہے اُسے وضاحت کے ساتھ دکھانے اور اُن کے کلام پر ہمدردانہ اور تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت باقی ہے۔

اس کے علاوہ غیر زبانوں کے ادب میں ایسے انمول جواہر ہیں جو صاحب نظر ادیب اور شائقین ادب کے لئے سب سے بڑا تحفہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ انھیں اُردو کے لباس میں پیش کیا جائے تاکہ ہمارے اہلِ ملک اسلوب بیان، طرز تخیل و ادائے مطلب سے حظ حاصل کریں اور متمتع ہوں۔

خود غیر زبانوں کے ادب کا بیان ہمارے لئے سبق آموز اور عبرت خیز ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس نے کن ذرایع سے ترقی حاصل کی اور اہلِ ملک کے خصائل و عادات پر کیا اثر ڈالا۔ اور ملک کے اُبھارنے اور بنانے میں کیا کام کیا۔

اس زمانہ میں اُردو کے حامی اور بہی خواہ اپنی زبان کو علمی زبان بنانے کے متمنی ہیں اور اس کے لئے بہت کچھ سعی بھی کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کس قدر دشوار اور کٹھن منزل ہے۔ جدید اصطلاحات اور نئے خیالات کے لئے الفاظ کی تلاش کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ باوجود ہزار سرگردانی اور جاں کاوی کے بیان تشنہ رہتا ہے اور مطلب ادا نہیں ہوتا۔ بعض اچھے اچھے ذہین اور مستعد اصحاب اس کوہ کنی اور مغز پاشی سے عاجز ہو کر کام چھوڑ بیٹھے ہیں یا یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے خیال و رائے کے مطابق من مانی الفاظ استعمال کرنے لگتا ہے جس سے پڑھنے والے کو سخت اُلجھن ہوتی ہے اور زبان میں کوئی لفظ قایم نہیں ہونے پاتا۔ لیکن کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کہاں کریں، اِن بحثوں کو کیونکر پیش کیا جائے اور فیصلہ کس طرح ہو۔ اِس کی ایک ہی صورت ہے جو ہمارے آپ کے پیشِ نظر ہے۔

علاوہ اِس کے زبان و ادب کے متعلق اور بہت سے مباحث اور مسائل ہیں جو کتابوں میں نہیں آسکتے جنھیں

الگ شایع نہیں کر سکتے۔ اُن کی کھپت ایسے ہی رسالہ میں ہو سکتی ہے جس کا یہی ایک مقصد ہے، تاکہ لوگ اُسے پڑھیں ضرورت ہو تو اپنے خیالات اور تنقید سے دوسروں کو مستفید کریں۔ اور عالمانہ بحث سے سب کو فائدہ پہونچے۔

پھر ایک بات اور ہے کہ بعض انشا پرداز ایسے بلند نظر اور پاکیزہ مذاق ہیں جو اپنے جگر پارے معمولی اخباروں اور عام رسالوں کے حوالہ کرنا نہیں چاہتے۔ اُن کے لئے بھی تو آخر کوئی سامان ہونا چاہیئے۔

غرض جس قدر غور کیجئے گا اُسی قدر اس مضمون میں وسعت نکلتی آئیگی۔ اِس قدر لکھنے کے بعد اب ضرورت باقی نہیں رہی کہ میں رسالہ کے مقاصد بیان کروں۔ مختصر یہ کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ رسالہ اُردو زبان اور ادب کی ایسی مفید اور محققانہ بحثوں سے مالامال ہو کہ شائقین ادب اُسے غور اور شوق سے پڑھیں اور فائدہ اٹھائیں اور اہل ملک کے ذوق پر اس کا اچھا اثر ہو اور وہ دن آئے کہ لوگ اِس کے پرچے ڈھونڈھتے پھریں۔

بعض احباب یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں کی آب و ہوا ایسے بلند پایہ رسالوں کے لئے راس نہیں۔ تہذیب الاخلاق اتنے دنوں رہا سوائے محدود قدردانوں کے اس کے خریداروں کی تعداد کبھی زیادہ نہ ہوئی۔ معارف نے بڑا زور مارا آخر اس کا جو حشر ہوا ظاہر ہے۔ حسن بھی چند سال اپنا جلوہ دکھا کر روپوش ہو گیا، دکن ریویو بڑے آن بان سے نکلا مگر نہ چل سکا اور بند کرنا پڑا۔ اب تم کس برتے پر یہ نیا رسالہ نکالتے ہو؟

یہ سب سچ ہے لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تہذیب الاخلاق نے ملک میں انقلاب پیدا کر دیا، خیالات میں ہلچل ڈال دی اور ادب اُردو میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اگرچہ اِس کے خریداروں کی تعداد محدود تھی اور تین بار نکل کے بند ہوا لیکن جو کام اس نے کیا وہ اُردو زبان میں ہمیشہ یادگار اور لائق تعریف رہیگا۔ اب بھی اُس کے مضامین مستقل کتابوں کی صورت میں شایع ہوتے ہیں اور لوگ ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور اُردو نصاب تعلیم کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اس کے مضامین نہوں۔ معارف اگرچہ ناقدردانی کی وجہ سے بند ہو گیا، لیکن اِس کے پرزور مضامین اور ادبی خوبیوں کی وجہ سے سارے ملک میں غلغلہ پڑ گیا تھا۔ اب بھی اس کے مضامین اُسی وقعت سے دیکھے جاتے ہیں اور وقت پر اس کے پرچوں کی تلاش ہوتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے اُردو زبان کی خدمت نہیں کی۔ اور اپنی ادبیت کا سکّہ لوگوں کے دلوں پر نہیں بٹھا دیا تھا۔ حسن اپنے محققانہ مضامین کی وجہ سے اب تک یاد آتا ہے۔ اُس وقت کے بہترین انشا پرداز اِس کے لکھنے والے تھے۔ اور

اُس نے اُردو زبان میں جو اضافہ کیا وہ ہر طرح قابلِ شکریہ ہے۔ دکن ریویو نے اُردو کی کچھ کم خدمت نہیں کی۔ وہ
جس آب و تاب سے نکلتا تھا اُس کے مضامین جس شوق سے پڑھے جاتے تھے اُس کے قدرداں اب بھی موجود ہیں۔ اس
کی نظم و نثر دونوں اُردو کے لیئے مایۂ ناز تھیں۔

اصل یہ ہے کہ کوئی چیز ہونی چاہیئے۔ جس مقصد سے جو کام کیا جائے اُس کا پورا حق ادا ہونا چاہیئے۔ خواہ وہ
ایک سال رہے یا دس بیس سال۔ مگر جب تک رہے اِس کی نظر بلندی کی طرف رہے پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ اگرچہ
اِس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کو جیسی ترقی ہونی چاہیئے تھی وہ نصیب نہیں ہوئی تاہم اس کا رُخ آگے کی طرف
ہے۔ لوگوں میں اپنی زبان کی ترقی کا احساس پیدا ہوتا جاتا ہے۔ ہر سال علمی اور ادبی کتابوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔
نئے نئے لکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ طرزِ تحریر میں نمایاں فرق ہوتا جاتا ہے۔ ترجمہ و تالیف میں نئی شان نظر آتی ہے
قدر دانوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ لکھنے پڑھنے اور کتابوں کا شوق بھی پہلے سے زیادہ نظر آتا ہے۔ ایسے
وقت میں ایک ایسے رسالہ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ کیونکہ جہاں حالت اُمید افزا اور شوق بڑھتا ہوا ہے، وہاں تھوڑا
سا کھٹکا بھی ہے۔ بعض نئے انشا پرداز جدّت کے دھوکے میں یا تقلید کے غیر محسوس اثر سے بے مزہ، مبہم اور دُور از
قیاس استعارات و تشبیہات اور نامربوط غریب اور بھونڈی ترکیبوں کی دلدل میں پھنس گئے ہیں اور شروع سے
آخر تک ایک عجیب قسم کی طرزِ تحریر ہوتی ہے۔ "عربی نہ فارسی نہ ترکی"۔ بعض صاحبوں نے ایسا رنگ اختیار کیا ہے
کہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو نہیں عربی فارسی لکھ رہے ہیں اور مرزا غالبؔ نے ابتدا میں فارسی آمیزش سے جو اُردو
نظم میں رنگ پیدا کیا تھا وہ اب اُردو نثر میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرا فرقہ اِن سے بھی چار قدم آگے ہے
جو انگریزی کا دلدادہ ہے۔ انگریزی الفاظ کا کہیں کہیں استعمال اگرچہ معیوب ہے مگر اتنا معیوب نہیں جتنی انگریزی نما
اُردو۔ انگریزی نما اُردو سے مُراد اُردو کی وہ طرزِ تحریر ہے جو فطرتِ اُردو کے خلاف انگریزی ترکیب اور وضع پر
لکھی جاتی ہے۔ جس میں اُکھڑے پکھڑے فقروں کو جوڑ کر انگریزی وضع کا ایک طول طویل جملہ بنا دیا جاتا ہے جس کے
سامنے ابوالفضل کی نثر بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جملوں کا بھونڈا اور طولانی ہونا تو ایک طرف، اس میں الفاظ
کا استعمال اور اُن کی غیر مانوس اور بے لطف ترکیب اور غضب ڈھاتی ہے۔ چند صاحب اس قسم کی اُردو
لکھیں تو خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن ڈر یہ ہے کہ اُن کی تقلید میں اگر دوسرے لوگ بھی اِسی ڈھڑے پر پڑ لیئے تو اُردو

کی آبرو خاک میں مل جائیگی۔ کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ اُردو زبان کی تاریخ میں ایک ایسا وقت آیا تھا جب کہ اُردو طرزِ تحریر پر فارسی عربی کے بے محل اور جا و بے جا استعمال سے فارسی عربی کا رنگ ایسا غالب آگیا تھا کہ اُردو کی حیثیت بگڑ چلی تھی۔ خدا خدا کرکے یہ جنون کم ہوا تو اب ایک دوسری بلا نازل ہوئی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح فارسیت کے غلبہ کو کم ہونے میں ایک مدت لگی، جس کے لیئے ہم سرسید، حالی و آزاد جیسے صحیح مذاق اور عالی پایہ انشا پردازوں کے ممنون ہیں، پھر ایک مدت گزرنے کے بعد ہماری آنکھیں کھلیں اور انگریزیت کے اثر کو مٹانے کے لیئے کسی خاص جدّ و جہد یا لطیفۂ غیبی کا انتظار کرنا پڑے۔ یہ کس قدر ظلم کی بات ہے کہ ہم دوسری زبانوں کو پڑھ پڑھ کر خود پسندی سے یا غرورِ علمیت میں اُن کی آمیزش اور آلایش سے اپنی زبان کو گندہ کردیں۔ ہر زبان خاص خاص خصوصیتیں رکھتی ہے، ہر زبان میں طرزِ ادا کے خاص اسلوب ہوتے ہیں، ہر زبان کی فصاحت جداگانہ ہوتی ہے۔ اور اس لیے اس میں لکھنے کے لیئے ان خصوصیتوں کا مطالعہ ضرور اور اُن کی پیروی لازم ہے۔ جدت کا کوئی مانع نہیں۔ یہ زبان کا حسن ہے بشرطیکہ حسنِ ذوق اُس کا ہمنوا ہو۔ کسی ایک زبان کو دوسری زبان کی خراد پر چڑھانا بدمذاقی ہی نہیں جہالت ہے۔ غلطی کا ہونا اس قدر قابلِ اعتراض نہیں جس قدر بے مزہ بے جان اور غیر مانوس طرزِ تحریر قابلِ اعتراض ہے۔ یہ گویا اُن زبان کا گلا گھونٹنا ہے۔ یہ ظاہری لباس کے تغیر و تبدل سے فرنگی کو حبشی یا حبشی کو فرنگی بنانا ہے۔

زبان کوئی بے جان یا مردہ شے نہیں ہے یہ بھی دوسرے جانداروں کی طرح بڑھتی گھٹتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ اس پر بھی آب و ہوا اور گرد و پیش کے دوسرے حالات کا اثر پڑتا ہے۔ اس لیئے اگر ہم اس کی صحت اور خوشحالی کے خواہاں ہیں تو ہمیں اِس کے اُصولِ نشو و نما سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔

زبان کے حسن و فروغ یعنی فصاحت کا دار و مدار صحیح ذوق پر ہے۔ اور صحیح ذوق کا پیدا کرنا اور پھیلانا سب سے بڑی خدمت زبان کی ہے۔ جن حضرات کے ہاتھ میں اخبار اور رسالے ہیں اُنھیں سب سے بڑھ کر یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کیونکہ اُن کی ذمہ داری بہت بڑی ہے اور عام طور پر لوگ اِنھیں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

ہمیں کسی کے مقابلہ میں کوئی خاص دعویٰ نہیں۔ لیکن ہم اپنی بساط کے موافق کوشش کرینگے کہ زبان کی خصوصیت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، پاک صاف اور شستہ زبان کا استعمال کریں اور ذوقِ سلیم کے پیدا کرنے میں طرح طرح سے مدد دیں۔

اِس لیئے جانے پہچانے، مقبول و معروف انشاپردازوں اور زبان کے ہوا خواہوں ہی سے نہیں بلکہ اُن سے بھی جو نام و نمود کے خواہاں نہیں اور گوشۂ عزلت میں رہ کر ادبی ذوق سے خود ہی حظ اُٹھاتے ہیں یہ التجا ہی کہ وہ ہماری اس سعی میں ہمیں مدد دیں۔ نیز ان حضرات سے جو کسی بلند پایہ رسالہ کے نہ ہونے سے اپنے خیالات کے اظہار میں مضائقہ کرتے تھے یہ درخواست ہی کہ اگر وہ اسے اپنے مذاق کے مطابق پائیں تو اعانت میں دریغ نہ فرمائیں۔

عبدالحق
آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو



محاسنِ کلامِ غالبؔ (اردو)

(از ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم)

انجمن ترقی اُردو کا ایک مدّت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اُردو دیوان کا ایک نفیس صحیح جدید اڈیشن طبع کرے۔ چنانچہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مُرتب کیا گیا۔ میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے اس کے لئے بطور مقدمہ کے غالب کے کلام پر تبصرہ لکھنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانہ میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کر دی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لئے اسے ترتیب دینا شروع کیا۔ لیکن افسوس اجل نے اتنی مہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی اور یہ ہونہار نوجوان جو علم و اخلاق کا پُتلا تھا بے وقت اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ یہ مضمون جو دیباچہ ... جدتِ فکر اور بلندیِ خیالات کے لحاظ سے اُردو زبان میں بالکل ایک نئی چیز ہے۔ مرحوم کی یادگار رہے گا۔ سب سے اول اس رسالہ میں درج کیا جاتا ہے۔ (اڈیٹر)

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے   دیوانِ مرا شہرت پرویں بودے

غالبؔ اگر ایں فنِ سخن دیں بودے   آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں **مقدس وید اور دیوانِ غالب** -

لوح سے تمّت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حدنگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز جذبہ اور وجدان ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے مگر یہ تقسیم خود اُن کی نارسی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمو میں محدود نہیں۔ شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔

جمال الٰہی ہر شے میں رُونما ہوتا ہے، آفرینش کی قدرت، جو صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانہ ایزدی میں پوشیدہ حُسن آفرینی میں مصروف ہیں، شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالبؔ نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے

کون سا "پیکر تصویر" ہی جو اُس کے "کاغذی پیرہن" پر منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر نھیں آتا۔

(۲)

اگر ادبی حیثیت سے غور کیا جائے تو دیوان غالب یکتا ہی۔ بلاغت یعنی تقلیل لفاظ بلا اختلال معنی اس سے زیادہ محال ہی۔ کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس کو بُرکن کہا جا سکے۔ فصاحت کی یہ کیفیت ہی گویا دریائے لطافت رواں ہی۔

اگر بوطیقا کی رُو سے لحاظ کیا جائے تو یہ کتاب اپنا آپ جواب ہی۔ شعر کی بنیاد عروض پر قایم ہی عروض موزونیت کی میزان میں الفاظ کے تولنے کا نام ہی۔ نقطۂ تعدیل کو پانے کے لئے صدہا نازک سے نازک اور گراں سے گراں اوزان سے کام لیا جاتا ہی۔ یہ اوزان شاعری نے موسیقی سے مستعار لئے ہیں کوئی آسان سی آسان اور مشکل سے مشکل بحر ایسی نہیں جس میں مرزا نے کلام موزوں نہ کیا ہو جہاں اُن کے ہاں وہ بحریں ہیں جو خطِ مستقیم سے مماثل ہیں وہیں وہ بحریں بھی موجود ہیں جن کی صورت از روئے اقلیدس خطوط منحنی اور دوائر سے مشابہ ہی۔ جہاں رواں بحریں موجود ہیں وہیں اُفتاں وخیزاں بحریں بھی ہیں مثلاً

دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا — کہتے ہیں نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
برقِ خرمنِ راحت خون گرم دہقاں ہے — کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے — آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہی دو قدم آگے — عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے

بہت سے شعرا جن میں اُستاد شامل ہیں عروض کو شعر کی تکمیل کے لئے کافی خیال کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ عروض کا مدعا اس موسیقی کی طرف سامعہ کو رہنما کرنا ہی جو قالب شعر کو اپنے دخل سے زندہ کرتی ہی۔ اگر شعر از روئے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن درست ہو لیکن آہنگ تشنہ رہ جائے تو خام ہی ایسا شعر مثل اک آئینہ کے ہی جو گلخن سے سالم اور درست باہر آئے لیکن صیقل سے محروم رہی۔

مرزا غالب کے لئے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہی یہی باعث ہی کہ دیوان کا ہر مصرعہ تار رباب نظر آتا ہی۔ اوزان رمل میں فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ایک نہایت مستعمل بحر ہی الفاظ نہایت آسانی سے اس کا

جامہ قبول کرلیتے ہیں۔ شعراء اُردو اکثر اس کو کام میں لاتے ہیں لیکن عیب اس میں یہ ہی کہ مصرعوں میں رقصِ صوتی کم پیدا ہوتا ہی۔ مثلاً یہ فارسی شعر ؎

ہر کہ خواہد گو بیاید ہر کہ خواہد گو برو
گیر و دار حاجب و درباں دریں دربار نیست

جو وصل و ترکیب کی بیش بہا مثال ہی باوجود اُستاد کی کاوش و کاہش کے معیار رسا نہیں ہوا اس کے مقابلہ میں یہ ترانہ ریز شعر ملاحظہ ہو

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

غالب کے شعر کی موسیقی کی خوبی بلا امداد ساز و ترنم کے ترتیل سے دریافت ہو سکتی ہی۔

(۳)

تنازع البقا میں مغلوب ہو کر ایشیائی ایسے مرعوب ہو گئے ہیں کہ اپنے ہر فعل و خیال کا موازنہ مغربی اقوال اور آراء سے کرنے لگے ہیں یہ وہ غلامی ہی جس کی زنجیروں کو تلوار بھی نہیں کاٹ سکتی پس کیا تعجب ہی اگر اس یورپ زدگی کر زمانہ میں طالب علم اور انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپیر ورڈس ورتھ Shakespeare, Wordsworth اور ٹے نی سن (Tennyson) سے مقابلہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کوتاہ نظر یہ نہیں جانتے کہ شاعری اور تنقید پر کیا نادانستہ ظلم ہوتا ہی۔

صلاح الدین خدا بخش نے غالب کا مقابلہ ہائن رش ہائنے (Heinrich Heine) المانی شاعر سے کیا ہی۔ کہاں ہائن رش ہائنے محض مبنی بر عشق و اُلفت کے مضامین بصورت قطعات افسردگی کے ساتھ بیان کر کے خاموش ہو جاتا ہی کہاں غالب جو دُنیا کو اطلس کی مثال اپنے شانوں پر اُٹھائے ہوئے ہی اور جس کا سمند سیارہ بہ سیارہ ہوتا ہوا افلاک الافلاک تک پہنچتا ہی۔

مرزا غالب کا صحیح اندازہ قایم کرنا خود ایک بلند پایہ شاعر ہی کا کام تھا اقبال نے بجا کہا ہی

آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہی　　گلشن ویمر Weimar میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہی

دُنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ہو سکتا ہی تو وہ شعرائے المانیہ کا سرتاج یوحنا ولف گانگ فان گٹے المعروف بہ گٹے (Johann Wolfgang von Goethe) ہی۔

غالب اور گٹے (Goethe) دونوں کی ہستی انسانی تصوّر کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے۔ شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہی۔ عتیق اور جدید خیالات حقیقت اور مجاز، قدرت اور حیات کی کثرت اُن کے دماغوں میں وحدت میں منتقل ہو کر وجود پاتی ہی دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں۔ تہذیب، تمدن، تعلیم، تربیت، فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں جس پر دونوں کا اثر نہ پڑا ہو۔

گٹے کو خود اپنے زمانہ میں شہرت حاصل ہوئی۔ غالب ان اہلِ کمال میں ہیں جن کو بقائے دوام کے کشور میں داخل ہونے کے لئے موت کے دروازہ سے گزرنا پڑتا ہی۔ گٹے کا کلام متعدد جلدوں میں ہی۔ غالب کا دیوان علاوہ قصائد و رباعیات ۵۰۰ غزلوں سے جن میں ایک ہزار چار سو چھپن اشعار ہیں زیادہ نہیں۔

گٹے کا کلام قومی اور ملکی ترقی کا باعث ہو چکا اور اپنا خاص منشا پورا کر چکا۔ غالب کا کلام اب مقبول ہوا ہی اور آئندہ نسلیں اس امر کا موازنہ کریں گی کہ اُن کی ترقی میں غالب کے کلام کا جزوِ اعظم کہاں تک مدد اور معاون ہوا ہی۔

گٹے کی نگاہ اشیا کے خارجی پہلو سے گذر کر داخلی کیفیت تک پہنچتی ہی۔ غالب کی نظر اندرونی کیفیت کے مشاہدہ سے بیرونی کیفیت کا قیاس کرتی ہی گویا غالب گٹے سے کہہ سکتے ہیں۔

Warheit suchen wır beide, du aussen im Leben
ich innen In dom Herzun, und so findet Sie ein
jeder geviss

(۴)

زبان ارضی ہی اور شاعرانہ خیالات سماوی ہیں ان دونوں کو وصل دینا گویا لطیف روح اور مکدر مادّہ سے جسم طیار کرنا ہی شعرا گو تلامیذ الرحمٰن ہیں لیکن ان میں بھی یہ قدرت نہیں کہ اپنے خیالات کا کامل اظہار کر سکیں۔ جو خیالات دل میں موجزن ہوتے ہیں، وہ اصلی لطافت کے بہت کچھ ضائع ہوئے بغیر روئے خیال سے روئے قرطاس تک نہیں آتے۔

اقبال نے اس احساس کو یوں بیان کیا ہی

زندگانی ہے مری مثل رباب خاموش　　جس کے ہر رنگ کے نغموں سے ہی لبریز آغوش

بربطِ کون و مکاں جس کی خموشی پہ نثار — جس کے ہر تار میں ہیں سیکڑوں نغموں کے مزار
محشرستانِ نوا کا ہے امیں جس کا سکوت — اور شرمندۂ ہنگامہ نہیں جس کا سکوت

آہ اُمیدِ محبت کی بر آئی نہ کبھی
چوٹ اس سازنے مضراب کی کھائی نہ کبھی

غالب کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہی یہاں تک کہ بعض جگہ سے چاک ہو گیا ہے اور عریاں بدن اندر سے نظر آتا ہی۔

چوں کہ مرزا غالب کا موضوعِ کلام بیشتر فلسفہ ہی یہ مشکل اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ فلسفہ چیز ہی ایسی ہے۔ فلابیر (Flaubert) فرانسیسی ناول نگار کا قول ہی

"جب میں کانٹ (Kant) اور ہے گل (Hegel) کو مطالعہ کے لئے اُٹھاتا ہوں تو سر میں درد ہونے لگتا ہی"

یہی باعث ہی کہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

دیوانِ غالب میں ایسے اشعار بھی ہیں جن کا مفہوم پانے سے ذہن مطلقاً قاصر ہی۔ تخیل عرصۂ امکان میں ہر جانب پرواز کے بعد مجبور واپس آجاتا ہی گویا ایک دائرہ ہی جس سے گریز ناممکن ہی۔ بعض نقاد اس کو "کیفِ شراب" پر محمول کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہی۔ گوئٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جو فاؤسٹ (Faust) حصۂ دوم میں ہی یہی اعتراض ہر جانب سے کیا گیا تھا۔ ایک دن ایکرمان (Eckermann) نے گوئٹے (Goethe) سے دریافت کیا کہ اِس اشکال کا کیا باعث ہی؟

گوئٹے نے جواب دیا یہی تاریکی ہی تو ہی جس پر لوگ فریفتہ ہیں۔ لوگ ان مقامات پر لاینحل مسائل کی مثال غور کرتے ہیں اور اپنی ناکامیابی سے نہیں اُکتاتے۔ انسانی طلب کی انتہا تحیّر ہی اگر کسی فعل سے حیرت پیدا ہو تو وہ کمالِ فن ہی اور بہاتِ پر اصرار نہ کرنا چاہیئے کہ اُس کے پس پشت کیا ہی۔ لیکن بچے جب آئینہ میں اپنا عکس دیکھکر

حیران ہوتے ہیں تو نادانی سے پشتِ آئینہ کو بھی دیکھنے لگتے ہیں۔

(۵)

فنون لطیفہ میں خوش نگاری کو فن تعمیر سے سب سے زیادہ مشابہت ہے۔ الفاظ وہ خشت و گل، چوب اور آہن ہیں جن سے ادبیات کی عمارت عبارت ہوتی ہے۔ میر حسن دہلوی کی طرح اطالوی شاعر ارسطو (ARISTO) نے اپنے دیوان میں عجب گلکار آئینہ بند منور اور پُر عشرت محلات طیار کیے ہیں۔ کسی نے اُس سے دریافت کیا کہ اے غریب کاشانہ نشین شاعر یہ ساز و سامان کہاں سے پایا ارسطو نے جواب دیا الفاظ خشت و سنگ سے ارزاں ہیں۔

لیکن مرزا غالب کے الفاظ لعل و جواہر سے بھی گراں ہیں مرزا غالب اس بات سے خوب واقف ہیں کہ مترادفات کو محض مولفان لغت نے طلبا کی سہولت کی غرض سے وضع کر لیا ہے ورنہ ایک معنی کے دو الفاظ کسی زبان میں نہیں ہیں توام بچے کتنے ہی ہم صورت ہوں ان کو ایک دوسرے کی عارضی غیر حاضری میں بھی ایک سمجھنا فاش غلطی ہے۔ مرزا الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو خوب جانتے ہیں وہ ادیبان فرانس کی طرح عقیدہ Mot Propre) کے پابند اور قائل ہیں۔ دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ مرزا نے ایک لفظ کو جہاں تک ہو سکا ہے دو بار استعمال نہیں کیا اس کی وجہ سحبان وائل کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرے بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے

زبان ارتقا کی پابند ہے۔ الفاظ بے جان نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ گو منطق کے قواعد لاتبدیل ہیں لیکن تصوّرات بمرور وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور چوں کہ تصوّر کے زبان سے ادا کرنے کا نام ہی لفظ ہے الفاظ بھی تغیر کا تقاضا رکھتے ہیں اگر یہ تجدید عہد بہ عہد نہ ہوتی رہے تو زبان کہنہ اور پارینہ ہو جائے۔ زبان کی تجدید مذہبی یا تمدنی اصلاح سے آسان نہیں جس طرح رواج پر غالب آنا مشکل ہے محاورہ کا مٹانا بھی مشکل ہے بہت سے ادیب اس نکتہ سے غافل ہیں کہ خوب سے خوب محاورہ بلحاظ عمر آخر ضعیف ہو کر بے جان ہو جاتا ہے چنانچہ اُردو میں اس وقت بہت سے محاورات ہیں جو حقیقت میں الفاظ اور فقرات کی "ممیاں" ہیں۔ مرزا نے اپنے دیوان میں محاورہ کی بندش سے اکثر احتراز کیا ہے۔ تمام دیوان میں مشکل سے دس اشعار ایسے ہیں جنھیں کوئی محاورہ باندھا ہے۔ مرزا کی شاعری دلّی کی گلیوں یا لکھنؤ کے کوچوں کی پابند نہیں بلکہ آزاد اُردو زبان ہے جب مرزا نے اپنے فلسفیانہ خیالات کے لئے موزوں الفاظ کی تلاش کی تو اُردو کے ذخیرہ الفاظ کو بہت محدود پایا۔ لیکن قاعدہ ہے کہ جہاں نیا خیال پیدا ہوتا ہے وہاں نیا لفظ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر جان اپنا جسم خود ہمراہ لاتی ہے۔ مرزا کے

خیالات نے اپنے اظہار کے لئے خود الفاظ تیار کر لئے بلکہ وقت نے مرزا کی مشکل پسند طبیعت کے لئے کام کم زیادہ آسان کر دیا الفاظ سازی کے فن میں مرزا اجتہاد کامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ الفاظ ملاحظہ ہوں :-

دام شنیدن۔ خمارِ رسوم۔ آتش خاموش۔ جوہر اندیشہ۔ گلبانگ تسلی۔ شبنمستان۔ دریائے مے۔ پہلوئے اندیشہ۔ غرق نمکداں۔ خانہ زاد زلف۔ زنجیر رسوائی۔ جمع و خرج دریا۔ موج نگاہ۔ نبض خس۔ تشنۂ فریادِ خلوتِ ناموس۔ صید ز دام جستہ۔ خود داریِ ساحل۔ شہپر رنگ۔ موجۂ گل۔ گزرگاہِ خیال۔ برگ ادراک۔ طالع خاشاک۔ آئینہ انتظار۔ خسِ جوہر۔ لذتِ سنگ۔ گردشِ رنگ۔ افشردۂ انگور۔ شہر آرزو۔ صحرا دستگاہ۔ دریا آشنا۔ محشرِ خیال۔ مژگانِ سوزن۔ مژگانِ یتیم۔ کنگر استغنا۔ سلکِ عافیت۔ معاشِ جنوں۔ دام تمنا۔ دریائے بے تابی۔ وادیِ خیال۔ سیاستِ دربان۔ نسیہ و نقد دو عالم۔ طلسم پیچ و تاب۔ طعنۂ نایافت۔ جنت نگاہ۔ فردوس گوش۔ کالبد دیوار۔ گلستانِ تسلی۔ چشمِ صحرا۔ شیرازۂ مژگاں۔ برخوردار بستر۔ رنگ فروغ۔ دامان خیال قلزم خون۔ غبار وحشت۔ شرار جستہ۔ جیبِ خیال۔ دعوتِ مژگاں۔

ان الفاظ کی جدت آشکارا و خوبیاں ظاہر ہیں بہت سے نکات ضرور قابل بیان ہیں لیکن اُن کی اس تمہید میں گنجایش نہیں۔

میکائیل آنجلو (Michael Angelo) کا قول ہے کہ مجسمہ ساز بت کو مرمر تراش کر نہیں بناتا بلکہ حقیقت میں بُت ابتدا ہی سے سنگ سفید میں موجود اور جلوہ نمائی کا منتظر اور متقاضی ہوتا ہے اُستادِ کامل محض پتھر کی عارضی چادر کو علٰحدہ کر دیتا ہے۔ یہی حالت مرزا کے ساختہ الفاظ کی ہے وہ ساختہ نہیں بلکہ ورجل (Vergil) کی مثال آفریدہ ہیں۔

مرزا غالب نے بعض اوقات قواعد کے خلاف زبان لکھی ہے اس کے متعلق سید فضل الحسن حسرت اور علی حیدر طباطبائی نے چند مناسب اور معقول اعتراضات کئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہے اور شاعری منطق سے آزاد ہے۔ علم القواعد کا کام تقریر اور تحریر میں صحت پیدا کرنا ہے۔ کلام میں لطافت پیدا کرنا نہیں۔ اس لئے بعض اوقات شاعر کو اپنے جذبات کے کامل اظہار کے لئے قیود سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔

فنون لطیفہ میں موسیقی یا مصوری کی تحصیل کے لئے علم الاصوات اور علم الالوان کا جاننا لازمی ہے لیکن گاہ گاہ ایک ایسا آتشِ نفس مغنی اور مانی قلم مصور پیدا ہوتا ہے جو بلا تعلیم اپنے زمانہ کا مجتہد ہوتا ہے بعینہ کبھی کبھی ایک ایسا پیغمبرِ سخن دنیا

میں آتا ہی جو نظریات اور قواعد زبان سے آزاد اور صرف روح القدس کا ترجمان ہوتا ہی۔

شیکسپیر (Shakespeare) اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے یہ قواعدِ زبان کا کام ہے کہ اُن کی پابندی کرے یا اُن کی خاطر اپنی درسیات میں خاص ضمیمہ جات کا اضافہ کرے۔

(۶)

جہاں مرزا نے الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہی وہیں تشبیہات اور استعارات میں بھی عام پابندی سے گریز کیا ہی۔ تشبیہات اور استعارات کی بنیاد قیاس پر قایم ہی۔ تشبیہ یا استعارہ کا پہلا کام معنی آفرینی ہے۔ کسی امر کو کتنا ہی واضح بیان کیا جائے ذہن مفہوم کے پانے سے قاصر رہتا ہی لیکن ایک مشابہ مثال کام دے جاتی ہی۔ بہت سے دشوار اور غریب اشعار حل نہیں ہوتے لیکن ایک مقابل شعر فوراً مضمون کو آئینہ بنا دیتا ہے۔ تشبیہ یا استعارہ کا دوسرا کام حسن آفرینی ہی۔ تشبیہات اور استعارات تصویر نظم کے بوقلموں الوان ہیں جن کی آمیزش بغیر تصویر اکثر تکمیل حیات کو نہیں پہنچتی اور بے رنگ رہ جاتی ہی۔ تشبیہ یا استعارہ کا تیسرا کام اختصار اور بلاغت پیدا کرتا ہی۔ جو بات دو لفظوں میں ادا ہو جاتی ہی وہ دوسری طرح دو سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

اُردو شاعری میں جو تشبیہات اور استعارات قدیم ہیں اور جو دور بدور چلے آتے ہیں اُن کو اصول مسلمہ خیال کیا جاتا ہی اور شعرا اُن سے بال برابر تجاوز کرنا گُناہ خیال کرتے ہیں چنانچہ بقول مولانا حالی معشوق کی صورت کو چاند، سورج یا جنت سے۔ آنکھ کو نرگس، بادام یا بیمار سے ابرو کو کمان یا محراب سے مژہ کو تیر سے لبوں کو نبات یا آبحیات سے، منہ کو غنچہ سے کمر کو بال سے اور دونوں کو عدم سے مشابہ قرار دینا مخصوص اور لازم ہو گیا ہی۔

مرزا نے خود کو اس تنگ دائرہ میں مقید نہیں کیا جس طرح ہر زمانہ کی تصویروں کا رنگ و روغن علیحدہ ہونا بہ تقاضائے وقت لازمی ہی، ہر زمانہ کی تشبیہات اور استعارات کا جدا ہونا بھی ضروری ہی۔

صاحب نظر ایک نگاہ میں محض رنگ سے تبلا سکتے ہیں کہ تصویر مصر کے عہد اوّلین سے ہندوستان کے عہد اجنتا سے یا فرنگ کے قرون وسطیٰ سے یا اطالیہ کے زمانہ احیا سے متعلق ہی۔ ہر عہد کے مصور اپنا رنگ بھی اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ ططیان (Titian) کے رنگوں میں بھی وہی سکون ہی جو اُس کی جنبش موقلم میں ہی اور گاگین Gaugin کے رنگوں میں بھی وہی ہیجان ہے جو ارتعاش اُس کے تخیل میں ہی۔ مرزا نے خود آفریدہ تشبیہات اور استعارات کا

اس بے تکلف انداز سے استعمال کیا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں موجود تھے اور ہزار بار کے سُنے ہوئے ہیں۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چنانچہ کس خوبی سے موئے آتش دیدہ کو زنجیر سے دانہ ہائے تسبیح کو صد دلِ عشاق سے۔ خانۂ مجنوں کو گردبے دروازہ سے بہار کو حنائے پائے خزاں سے جو ہر آئینہ کو طوطیِ بسمل سے، حضرت یعقوب کی نابینا آنکھوں کو روزنِ دیوارِ زندانِ یوسف سے دامِ موج کو حلقۂ صد کامِ نہنگ سے۔ تارِ اشکِ یاس کو رشتۂ چشمِ سوزن سے۔ ہر قطرۂ خونِ تن کو نگیں نامِ معشوق سے۔ دریا کو زمین کے عرقِ انفعال سے سرمہ کو دودِ شعلۂ آواز سے نالہ کو گردشِ سیارہ کی صدا سے صبحِ وطن کو خندۂ دنداں نما سے موئے شیشہ کو دیدۂ ساغر کی مژگاں سے۔ آئینہ کو ورطہ سے۔ موجِ شراب کو مژۂ خواب ناک سے ساغر کو متاعِ دستگراں سے وعلیٰ ہذا مماثل بیان کیا ہے۔

مولٰنا شبلی نے صنائع اور بدائع کے متعلق بحث کرتے ہوئے بجا کہا ہے کہ ان کا نتیجہ شاعروں کے لئے کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے زیادہ نہیں۔ کلام میں جس قدر صنائع اور بدائع کے استعمال کی زیادتی ہوگی اتنا ہی کلام حقیقت سے بعید اور تصنع سے قریب ہوگا۔ خاموش اور کم مطلب اشعار محض آرایش کے قواعد سے گویا اور پُر معنی نہیں بن سکتے حسن قوانین کا پابند نہیں ہے بلکہ ہمہ قیود سے آزاد ہے۔ مارکو دل پنیو کے قواعد مصوّری کی رُو سے عورت کا بدن تصویر کے خاکہ میں ایک خطِ منحنی کو ایک دو اور تین میں حسابی قاعدہ سے ضرب دینے سے قایم ہوتا ہے۔ بھلا کہیں بے جان لکیریں نسوانی جسم کی شعریت کو وجود میں لاسکتی ہیں۔ بعض تصویر نگار مختلف رنگوں میں مختلف معنی بیان کرتے ہیں افلاطون کے پیرو کہتے ہیں کہ حُسن روح میں ہے۔ ارسطو کے متبعین مخالفت کرتے ہیں کہ جسم میں ہے لیکن درحقیقت نہ پیکرِ معشوق میں کوئی معین خطوط ہیں نہ کسی رنگ میں کوئی خاص مناسبت ہے۔ خوبی نہ روح سے متعلق ہے نہ جسم سے محدود ہے حُسن حُسن ہے جس کی آفرینش شعرا کا کام اور راز ہے جس طرح اقلیدسی خطوط سے خوبصورت سراپا نہیں بن سکتا صنائع اور بدائع سے خوب کلام ترتیب نہیں پا سکتا۔ قابلِ عزت ہیں وہ تمام فضلا جنہوں نے علمِ صنائع اور بدائع کو فروغ دیا ہے لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلا دی جائیں تو شعرا کا ذرا بھی نقصان نہیں۔

صنائع اور بدائع کے استعمال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں آمد نہیں ہے۔ صنائع اور بدائع کا استعمال کلام کو عام ادبی زندگی سے جدا کر دیتا ہے اور جس زمانہ میں صنائع اور بدائع کا عام رواج ہو وہ زمانہ اقوام کے انحطاط اور زوال کا ہوتا ہے۔ غالب بہت کم صنائع اور بدائع کا استعمال کرتے ہیں اُن کے کلام کے اِشکال کا باعث فارسیت کا غلبہ الفاظ کا ادق ہونا اور ترتیب کا پس و پیش ہونا ہے اُس میں صنائع اور بدائع کی مشکلات کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔

لیکن ایک خصوصیت اُن کے کلام میں ایسی ہے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان مضمر ہیں اُن کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں جیسے کولمبس نے امریکا کو دریافت کیا تھا مولانا حالی نے مرزا غالب کے کلام میں اس نئی دُنیا کا پتہ لگایا ہے اور حقیقت میں مولانا حالی مرزا غالب سے کچھ کم مستحقِ داد نہیں ہیں ؎

(۱)
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ دشت اس قدر ویراں ہے کہ خوف سے گھر یاد آتا ہے وہیں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم تو گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی لیکن دشت بھی اتنا ویراں ہے کہ اُس کو دیکھنے سے گھر کی ویرانی یاد آتی ہے

(۲)
کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ میرے مرنے کے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں اور ساقی یعنی معشوق کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دوسرے لطیف معنی یہ پنہاں ہیں کہ ساقی مصرعۂ اولیٰ کو مکرر پڑھتا ہے ایک دفعہ بلانے کے لہجہ میں یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو پھر جب اُس کی آواز پر کوئی نہیں آتا تو اُسی مصرعہ کو مایوسی کے ساتھ پڑھتا ہے یعنی کوئی نہیں۔

(۳)
کیوں کہ اُس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر میں اُس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا۔ اس لئے جان کو عزیز

نہیں رکھتا اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بُت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے پھر اُس سے جان کیوں کر عزیز رکھی جا سکتی ہی۔

ترے سروِ قامت سے اِک قدِ آدم
(۴)
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروِ قامت سے فتنۂ قیامت کم ہی اور دوسرے معنی یہ بھی کہ چوں کہ تیرا قد اسی میں سے بنایا گیا ہی اس لئے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہی۔

سر اوڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
(۵)
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہی ہم کو

اس جملہ کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور سر اُڑائیں گے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو تیری سر کی قسم ہی یعنی ہم تیرا سر کبھی نہ اُڑائیں گے۔

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
(۶)
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

اس کا ایک مطلب تو یہ ہی کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

(۷)

بعض کا خیال ہی کہ شاعری مصوّری ہے۔ اس پہلو سے بھی دیوان غالب عدیم المثال ہی۔ ہر ورق پر ایسے اشعار موجود ہیں جن کو صفحۂ قرطاس سے جامۂ تصویر پر منتقل کیا جا سکتا ہی۔

شعر کو تصویر پر یہ ترجیح ہی کہ تصویر ساکن اور شعر متحرک ہی۔ تصویر اپنے قایم کردہ انداز کو نہیں بدل سکتی شعر ایک کیفیت کی مختلف حرکات کو ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہی۔ تصویر رقبۂ حیات پر ایک نقطہ ہی شعر ایک دائرہ ہے۔ حُسن و عشق کے تمام معاملات کو مرزا نے اس خوبی سے نظم کیا ہی کہ ہُو بہو تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہی۔ اس کے

لئے صرف زبان پر قدرت ہونا کافی نہیں بلکہ فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا ضروری ہے۔ کیا خوب زندگی کی روزمرہ تصویریں ہیں مثلاً کہتے ہیں۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
(۱)
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

تصور گوش آشنا ہوتے ہی اوّل دُرِ دنداں اور لب مرجاں کا خاکہ کھینچتا ہی پھر مستی کی ادا ہٹ اور پان کی سُرخی سے اُن میں تبسّم کا رنگ بھرتا ہی پھر رُو نمائی میں مشغول ہوتا ہے اور سرمہ کی تحریر اور قشقہ کی لکیر تک نہیں بھولتا پھر گردن کے اُتار اور سینے کے اُبھار کے خطوط کی کشش سے پیکر طیار کرتا ہے اور اس ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دستِ خیائی میں جو پردہ ہی وہ بھی اور جس غرفہ میں وہ پردہ آویزاں ہی اُس کو بھی دکھلاتا ہی۔

کہیں کہیں روزمرّہ تصاویر کا دوسرا رُخ دکھایا ہے یعنی واقعات حقیقت اور قدرت کے مطابق ہیں لیکن اُمید اور عادت کے خلاف ہیں مثلاً

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
(۲)
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

وہ صنم جو عشق کو جنون کہتا تھا جو حُسن کے اثر کا منکر تھا اور ہر عاشق و معشوق سے رم کرتا تھا اپنے جمال کے ایک جلوے سے کیا حیراں ہی۔ یار کے آئینہ کی جانب بے پرواہ نتاشن بڑھنے اپنی صورت سے دوچار ہونے اور "نرگس" کی طرح تیر عشق کا نشانہ ہو کر بے اختیار پیچھے ہٹنے کا کیا صادق عکس ہی۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
(۳)
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
(۴)
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

یار محوِ خواب ہی اور عاشق پابوسی کے لئے جھکنا چاہتا ہی لیکن اس خیال سے کہ ممکن الامر اگر معشوق بیدار ہو گیا تو تمام عمر کے لئے اعتبار جاتا رہیگا باز رہتا ہی عقل و شوق، اندیشہ اور آرزو کے کیا متضاد تقاضات ہیں۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
(۵) یار لائے مری بالیں پہ اُسے پر کس وقت

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی
(۶) ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
(۷) جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
(۸) ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھکر عذرِ مستی ایک دن

امیر خسرو کا ایک شعر ہے

جاناں اگر شبیت دہن بر دہن نہم
خود را بخواب سازو مگوئیں دہانِ کیست

مرزا غالبؔ نے اپنے شعر میں دوگونہ لطف پیدا کیا ہے پہلے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ نشہ کا بہانہ کرکے ہم سے کھل جاؤ کوئی یہ نہ جانے گا کہ تمہاری آرزو سے ایسا ہوا ہے دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں خود نشہ کا بہانہ کرکے پیش قدمی کروں گا اور پھر خواہ تم کچھ ہی کہو سب مجھے معذور کہیں گے۔

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
(۹) تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

اس شعر کو پڑھتے ہی مجنون بنی عامر کے آخری کلام کا مضمون یاد آجاتا ہے البتہ جو درد اور گداز اُس وارفتہ کے اشعار میں ہے وہ اس میں نہیں۔

بِرَبِّیْ هَلْ ضَمَمْتَ اِلَیْكَ لَیْلٰی
قُبَیْلَ الصُّبْحِ اَوْ قَبَّلْتَ فَاهَا
وَهَلْ رَفَّتْ عَلَیْكَ قُرُوْنُ لَیْلٰی
رَفِیْفَ الْاُقْحُوَانَةِ فِیْ نَدَاهَا

تجھے خدا کی قسم ہے کیا صبح کے پہلے تو نے لیلیٰ کو سینہ سے لگایا ہے یا اُس کے مُنہ پر بوسہ دیا ہے۔ کیا تیری اوپر لیلیٰ کی زلفیں لہرائی ہیں جس طرح کہ گلِ بابونہ لہراتا ہے۔

(۱۰)
واں وہ غرورِ عزّ و نازیاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

(۱۱)
رات کے وقت مَے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

(۱۲)
تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

(۱۳)
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

(۱۴)
غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

(۱۵)
سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہ گزر ہے کیا کہئے

اگر وہ مرقع ساز جو عشق و محبت کے معاملات کے نئے نئے مضامین کے متلاشی رہتے ہیں مندرجہ بالا اشعار کو لوحِ قرطاس سے پردہ تصویر پر منتقل کریں تو ان میں سے ہر ایک ایک یادگار زمانہ تصویر ہو۔ مرزا کا قلم موقلم ہے۔

(۸)

اقبالؔ نے مرزا غالبؔ کی شان میں کہا ہے

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تصوّر کی رسائی تا کجا!

کتابِ قدرت ایک تاریک کتاب ہے جس کے اوراق پر سوائے شعرا کے کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اس ضیا میں ہر شئے ایک نئی صورت اور کیفیت میں مشاہدہ ہوتی ہے لیکن روشنی شعشۂ برق کی مثال دم زدن میں غائب ہو جاتی ہے اور پھر وہی ظلمت چھا جاتی ہے اس روشنی میں ہر رگِ سنگ میں خونِ شہیداں اور ہر شرارِ سنگ میں جلوۂ یزداں نظر آتا ہے۔ یہ کوئی شاعرانہ دروغ یا فریبِ نظر نہیں بلکہ مشاہدۂ حقیقت ہے۔

جب شعرا گرد و پیش کے مناظر اور واقعات کو دور از کار اور فوق الفطرت طور پر بیان کرتے ہیں تو وہ بیان اُن کے عینی اور یقینی نظارہ پر مبنی ہوتا ہے۔

وہ نام نہاد شاعر ہیں جو محض الفاظ کے پس و پیش سے تمثیلات تیار کرتے ہیں اور نابینا ہونے کے باعث خود

اُن کو نہیں دیکھ سکتے۔

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
(۱)
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تھا

وفا جو ایک صفتِ قلبی ہے شاعر کو خارجاً دشت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اور دشت بھی بے آب۔ ہر جانب جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے ریگ رواں ہی اور سَراب کے ذرّات جوہرِ تیغ آبدار کی طرح تمازتِ آفتاب میں لرزاں ہیں اس مقامِ لق و دق کی صحرا نوردی کا نام عشق ہے۔

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
(۲)
بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

عاشق چاند کو دیکھتا ہی۔ چاند کے مشاہدہ سے معاً یہ خیال اُس کے دل میں پیدا ہوتا ہی کہ اگر میں نے رازِ الفت اور دردِ فرقت کو اور چھپایا تو میں دیوانہ ہو جاؤں گا اور کوئی اتنا بھی تو نہ جانے گا کہ میرے جنون کا باعث کیا ہی میرے غمخواروں اور میرے محبوب تک کو خبر نہ ہو گی۔
گویا یہ ماہتاب جس کی روشنی میرے قلب میں مانیا کا تلاطم پیدا کر رہی ہے میرے لئے مُہرِ دہاں ہو جائے گا
ورڈس ورتھ (Wordsworth) غروبِ ماہتاب کی کیفیت کے مشاہدہ سے متاثر ہو کر بے اختیار کہتا ہی

"O Mercy, to myself I cried
If Lucy should be dead"

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
(۳)
ہر قدم سایہ کو اپنے میں شبستاں سمجھا

عاشق سفرِ عشق میں اس درجہ خستہ جاں اور مضمحل ہو گیا ہی کہ قدم قدم پر ضعف سے لغزش ہوتی ہی اور آگے بڑھنے کا یارا نہیں اس ادبی مضمون کو وسعتِ تخیل اس طور پر ادا کرتا ہے کہ جس طرح تشنہ لب مسافر کو دشت میں سَراب دریائے آب معلوم ہوتا ہی۔ شکستہ روح اور مجروح بدن عاشق کو اپنے سایہ پر خوابگاہِ منزل کا گمان ہوتا ہے۔ ہر لحظہ خیال کرتا ہی کہ مقامِ مقصود کو پا لیا اور ہر لحظہ چونکتا ہی کہ نہیں ہنوز دشتِ ناپید اکنار کے عین وسط میں ہی۔

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا (۴)

کہتے ہیں کہ جب مجنوں کا شباب عشق تھا میرا وقت طفلی تھا تمام شہر کے بچے مجنوں کو پتھروں سے مارا کرتے تھے
کہ اقتضائے بچپن ہی میں نے بھی ایک بار دیگر ہم عمروں کی طرح اس ستم زدہ کو نشانۂ سنگ بنانے کی غرض سے پتھر اُٹھایا
دم زدن میں اپنی تمام آیندہ زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا کیا دیکھتا ہوں کہ میں آگے آگے ہوں اور اطفال شہر
پیچھے پیچھے اور خشت و سنگ کی بارش کر رہے ہیں یعنی سرشت عشق طفلی کی نافہمی سے آزاد ہی گو لڑکپن کا زمانہ تھا لیکن
پہلے ہی کجروی پر ضمیر عاشقی نے متنبہ کر دیا۔

جس طرح نبوت بطن مادر سے شروع ہوتی ہے عشق بھی عہد طفلی سے آغاز ہوتا ہی چنانچہ خود مجنوں کا قول اُس کا
مصداق ہے۔

اَلَا اَیُّھَا الْقَلْبُ الَّذِیْ لَجَّ ھَائِمًا
وَلِیْدًا بِلَیْلٰی لَمْ تُقَطَّعْ تَمَائِمُہٗ

میں لیلیٰ کے عشق کے بھنور میں اُسی وقت پھنس گیا تھا جب کہ بچہ تھا اور میرے گلے کے تعویز بھی نہ کٹے تھے
ایک روایت ہی کہ منصور کو انا الحق کہنے کے باعث لوگ خشت و سنگ سے سرزنش کیا کرتے تھے ایک دن شبلی کا بھی
اُس راہ سے گزر ہوا۔ شبلی نے شاید از راہ مزاح ایک پھول منصور کی جانب پھینک دیا۔ منصور کو نہایت درجہ ملال ہوا
کیوں کہ شبلی جو خود عاشقانِ خدا میں سے تھے منصور کے معاملہ سے واقف تھے۔

ضرور ہے کہ جب مرزا نے مجنوں پر پتھر اُٹھایا ہوگا تو مجنوں نے شکایتاً مڑ کر اُن کی طرف دیکھا ہوگا۔

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا (۵)

عاشق کے مقتل کو جانے کی مسرت کا اندازہ ممکن نہیں دامنِ نگاہ یعنی "بھر لجا کہ مے نگرم" تمام افق زخموں کے خیال
کی بہار سے پُرگل ہی۔ یہ گلزارِ عاشق گلزارِ خلیل اللہ سے کم نہیں۔

(۶) پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن سایۂ تاک میں ہوتی ہی ہوا موجِ شراب

موسم باراں ہیں ابر و ہوا کا زور ہی باغ سے تا بباغبان سب شور بور ہیں درخت جوشش شباب سے سبزے سے تیرہ گوں سبز ہوگئے ہیں۔ گویا یہ مست رندان چمن وجد میں ہیں۔ تمام باغ پر سرور کا اثر معلوم ہوتا ہی۔

گلوں کا لب نہر پر جھومنا — اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر — نشہ کا سا عالم گلستان پر (میر حسن)

مرزا کہتے ہیں کہ یہ کیفیت ہی کہ نم بارش آلود ہوا خوشہ انگور کے مس سے لطیف شراب ہوجاتی ہے۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے واں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں میں (۷)

جب زلیخا نے یوسف سے اپنا مقصود دل نہ پایا تو عزیز سے کہکر زندان میں بھیجدیا۔ یہ زلیخا کی آخری کوشش تھی کہ شاید وہ دلربا تکلیف قید سے مان جائے لیکن ادھر یوسف روانہ ہوا ادھر داروغہ کو فرمان ہوا کہ محبس کی آرایش میں مشغول ہوتاکہ وہ نازنین قید سے زیادہ ملول نہ ہو۔

معطر دار دیوار و درش را

منور ساز طاق و منظرش را (جامی)

چنانچہ معمار حجرہ یوسف میں سفیدی میں مشغول ہیں مرزا کا خیال کہاں سے کہاں منتقل ہوتا ہی اُن کو یہ سفیدی دیدۂ یعقوب کی نابینا آنکھوں کی سفیدی معلوم ہوتی ہے۔

پدرش نگران ست کہ یوسف بہ زندان ست۔

غم نہیں ہوتا ہی آزادوں کو بیش از یک نفس

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم (۸)

دُنیا کی تکالیف علائق سے ہیں جو اضافت اور نسبت سے بری ہیں وہ الم سے بھی سبکدوش ہیں۔ آزاد بظاہر میں سب سے زیادہ آزار پاتے اور رنج اُٹھاتے ہیں اور شب و روز تاریک ماتم خانہ میں رہتے ہیں لیکن واقعاً غم کا اثر اُن پر عارضی اور فوری ہوتا ہی۔ مرزا نے اس سکون طبیعت کی کیا فوق الخیال مثال دیتی ہیں کہ جب برق بلا گرتی ہی تو ہم بجائے خوف زدہ اور پریشان ہونے کے کمال اطمینان سے اُٹھکر حوالہ برق سی اپنے

الم کدہ کی خاموش کشتہ شمع کو روشن کر لیتے ہیں۔

شوق اُس دشت میں دوڑائے ہے مجھکو کہجہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں (۹)

دشتِ وفا میں عشق کی تگ و دو کا انجام موت ہی اس بحرِ سراب کا کوئی ساحل نہیں کوئی جادہ نہیں جس سے مسافر صحرا سے جان سلامت لے جا سکے۔ راہ کے عدم کو مرزا کمال شاعری سے یوں بیان کرتے ہیں کہ صرف ایک راستہ ہی اور وہ نگہ دیدہ تصویر ہے یعنی کوئی راستہ نہیں۔ کیا خوب عدم کو وجود کے لباس میں جلوہ گر کیا ہی۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوار زنداں ہو گئیں (۱۰)

حضرت یعقوب کی آنکھیں فرزند کے فراق میں روتے روتے سفید ہو گئی تھیں۔ مرزا کے فکر رسا نے اس تاثیرِ عشق کا کیا طرفہ مضمون پیدا کیا ہی کہ وہ روزن جو دیوار زندان یوسف میں ہیں حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں ہیں جو اپنے فرزند کو دیکھتی رہتی ہیں۔ سفید نابینا آنکھوں کو جو روزن سے مشابہت ہی ظاہر ہے۔ قطرہ قطرہ پانی اگر کہیں گرتا رہتا ہے تو مرمر اور فولاد تک میں سوراخ کر دیتا ہی۔ حضرت یعقوب کی مدام اشکباری سے دیوار زنداں میں سوراخ ہو گئے ہیں جس طرح روزنِ دیوار کبھی بند نہیں ہوتے حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں کبھی بند نہیں ہوتیں رات دن بیتاب جانب یوسف نگراں رہتی ہیں۔ حضرت یعقوب کی آنکھیں روزنِ دیوار زنداں ہو گئیں تاکہ تاریکی اور حبس سے یوسف کا دم خفا نہ ہو۔ آنکھیں روزنِ دیوار زنداں ہو گئیں تاکہ یوسف زنداں سے دُنیا کا تماشہ دیکھ سکیں اور تنہائی سے پریشان نہ ہوں۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو کر رہا ہو جائیے (۱۱)

حیات بعد الممات اور بقائے روح کی کیا عجیب مثال دی ہے۔

(۹)

قدرت مستورِ حقیقت ہی قدرت اور عوام کے درمیان ایک دیوار حائل ہی جس میں سے صرف شاعر کی نظروں کی

العیاشعائیں گذرپاتی ہیں۔

مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے جو شعرا قدرت کے ترجمان ہیں اُن میں سے اکثر سعدی اور ورڈس ورتھ (Wordsworth) کی طرح قدرت سے تماشائے بہار و خزاں باغ و راغ، کہسار و آبشار مراد لیتے ہیں۔ غالب کے مشاہدات کنار دریا، دامن کوہ، لب جُو سے بہت کم متعلق ہیں مرزا کا جی لب دریا خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے پرشور کوچوں میں لگتا ہے جہاں زندگی شعاع منتشر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔ مرزا کے نزدیک دلی کی گلیوں کی رونق یا ویرانی، خوش وقتی، یا افسردگی، شورش یا خاموشی خود اُن کے اپنے احساسات کی خارجی تصویریں ہیں۔ جو صورتیں اِدھر اُدھر رواں دواں نظر آتی ہیں وہ مرزا کے نزدیک اُن کے اپنے خیالات کے مجسمات ہیں۔ اُن کو القا کے لئے سرو وچنار کو شب ماہ لب آب صحبت یار میں باساغر و نے دیکھنے کی ضرورت نہیں وہ اگر کسی بنتی ہوئی عمارت پر نصب شدہ جرثقیل کا آہنی حلقہ بھی رسی میں آویزاں دیکھتے ہیں تو اُن کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیمرغ اپنا چنگل آسمان سے تارے توڑنے کے لئے دراز کر رہا ہے جن مظاہر قدرت کو مرزا دیکھتے ہیں اور شعرا یا تو اُن کو عام خیال کر کے اُن پر غور ہی نہیں کرتے یا ان میں اس درجہ شعریت نہیں پاتے کہ اُن کی کیفیت کو اپنے کلام میں بیان کریں اور اگر کرتے ہیں تو کامیاب نہیں ہوتے مثلاً۔

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے

(۱) شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

کون ہے جس نے شمع کو گل ہوتے نہیں دیکھا لیکن کسی شاعر نے مشاہدہ کیا ہے کہ شعلے کے ختم ہو جانے کے بعد دیر تک فتیلہ سے دھواں اُٹھتا رہتا ہے۔ عاشق کی موت کی اس سے بہتر کیا تمثیل ہو سکتی ہے۔

برنگ کاغذ آتش زدہ ہم رنگ بیتابی

(۲) ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک طپیدن پر

حروف آشنا کاغذ گویا بلکہ زندہ ہوتا ہے کاغذ چونکہ کلام ربی اور کلمات بشری کا حامل ہے، کاغذ کے جلانے کو عیب خیال کیا جاتا ہے لیکن کاغذ کی تحریر مستقل سند ہوتی ہے اس لئے شہادت کو تلف کرنے کے لئے کاغذ کا ضائع کرنا بسا اوقات لازمی ہو جاتا ہے۔ معشوق ابتدا سے نامہائے عشاق کو جلاتے آئے ہیں لیکن کسی شاعر کے

مشاہدہ میں یہ نہ آیا کہ کاغذ کے جلنے میں کیا شاعرانہ کیفیات نہاں بلکہ عیاں ہیں۔ جب کاغذ کو آگ میں ڈالا جاتا ہے تو ذرا سی دیر آتش بلند ہوکر شعلہ بجھ جاتا ہے اور سُرخ و سیاہ رنگ کا غذ کا نیم جاں جسم رہ جاتا ہے جس میں سکرات اور نزع کی تمام علامات نظر آتی ہیں پھر یہ ارتعاش حیات بھی فرو ہو جاتا ہے اور سراپا جل چکنے کے بعد ہزاروں نقطہ ہائے روشن کاغذ پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ آخر کار کاغذ خاکستر ہو جاتا ہے۔

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
(۳) کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

جو شہر دریاؤں کے کنارے واقع ہوتے ہیں بعض اوقات شدّت آب کی وجہ سے غرق سیلاب ہو جاتے ہیں بلا دحیدر آباد اور لکھنؤ کے واقعات سب کو یاد ہیں جب آب دریا طغیانی کے ساتھ شارعات سے مکانات میں داخل ہوتا ہے تو جہاں سے راہ پاتا ہے در آتا چلا جاتا ہے۔ جہاں داخل ہونے میں مزاحمت ہوتی ہے پانی کف لے آتا ہے۔ جب جوش دریا فرو ہو چکتا ہے تو سطح آب پھر نیچی ہو جاتی ہے اور پانی واپس دریا کی جانب رواں ہو جاتا ہے لیکن کفِ سیلاب جس جس جوف اور سُوراخ میں پیدا ہوا تھا وہ وہیں باقی رہ جاتا ہے اور تارِ عنکبوت کی طرح اس رخنہ کو بند کر دیتا ہے۔

ہوئی اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
(۴) پرافشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرّہ روزن میں

جو لوگ علم مناظر و مرایا سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر کسی ذرہ کو کسی روزن میں آنکھ لگا کر دیکھا جائے تو ذرہ کے بے مقدار جسم سے ہر سمت شعاعیں نکلی ہوئی نظر آتی ہیں اس کا باعث آفتاب کی روشنی ہے جس کے عکس سے ذرہ کا جسم خارجاً روشن ہو جاتا ہے۔ یہ شعاعیں بعینہٖ ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا پھلجڑی چھوٹ رہی ہے مرزا غالب اس کو ذرّہ کا پرافشاں ہونا کہتے ہیں۔

سوال ہے کہ مرزا کے وقت میں تو کیا اس زمانہ میں بھی جب کہ انکسار اور انعکاس کے مسائل زبان زد عام ہیں کتنے اشخاص ایسے ہیں جو اس کیفیت سے واقف ہیں۔

ایک اور معنی اس شعر کے ممکن ہیں۔ مرزا نے بعض اوقات پرافشانی کو پَر زنی کے معنوں میں بھی استعمال

کیا ہے مثلاً :-

کروں بیدادِ ذوقِ پر فشانی عرض کیا قدرت
(۴)
کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میری شہپر کی

اگر یہاں بھی یہی معنی ہیں تو ذرّات کی پرواز مراد ہے چنانچہ ایام گرما میں دوپہر کے وقت تاریک کمرے میں اگر کوئی آفتاب کی کرن سیاہ پوش روشن دان کے کسی رخنہ سے اندر آجاتی ہی تو غبار کے باریک ذرّے جو خطِ شعاع سے روشن ہوجاتے ہیں اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر اُڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
(۵)
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

کہنہ اور زوال رسیدہ عمارات میں آب و ہوا کے مدام اور پیہم اثر سے سنگ سفید اور سنگ موسیٰ کے ریختہ مربعات پر کائی جم جاتی ہے اور بعض اوقات دیواروں سے پانی رسنے لگتا ہی۔ سیاہ و سفید شکستہ مرمر کی بالائی خشت سے قطرہ قطرہ آب گرتا رہتا ہی۔ قطرے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے آتے ہیں اور جو سب سے آگے ہوتا ہی وہ مقام مقرّرہ پر پہنچ کر چشم زدن توقف کے بعد گر پڑتا ہی۔ جو چیز قطرے کو فوراً گر پڑنے سے روکتی ہی وہ پانی کے سالمات کا باہم ملصق ہونا ہی لیکن کہاں ایک قطرہ کی قوت قرار کہاں تمام کرۂ ارض کی کشش ثقل قطرہ کیا تاب لاسکتا ہی۔ مرزا غالب اپنے دل کا ٹپکتے ہوئے قطرے سے مقابلہ کرتے ہیں۔ انسان کے دل کو اطباء فرنگ نے ناسپاتی سے تشبیہ دی ہے لیکن درخت میں آویزاں ناسپاتی کا بالائی حصّہ خورد اور زیرین حصّہ کلاں ہوتا ہی اور دل کی حالت اس کے خلاف ہی۔ دل کی کوئی تشبیہ خون کے ٹپکتے ہوئے قطرے سے بہتر ممکن نہیں علاوہ ازیں دل کی لاچاری اور عاجزی کی کیا تصویر ہی۔

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہی صدا
(۶)
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہی

کس شاعر نے آج تک آتش کے فرو ہونے کی اس ظاہر اور ادنیٰ کیفیت کو مشاہدہ اور محسوس کیا ہے لفظ "ہر کوئی" میں آگ کے طبعاً مغرور اور سرکش ہونے کا اشارہ نہایت خوبی سے مضمر ہی۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
(۷) آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

وینس (Venice) براعظم یورپ کا حلب ہے۔ وینس کے بلوریں جام و ساغر مشہور ہیں اُن کی نزاکت کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔ دیکھکر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ صناعوں کے ہاتھ چوم لے۔ آئینہ گر حقیقت میں عمر خیام کے کوزہ گر سے کہیں زیادہ "خالق" کے لقب کا مستحق ہے جو گلخن میں مغشوش ریگ کو رفتہ رفتہ تربیت سے مینا کر دیتا ہے۔ مینا سے بلور بنا دیتا ہے بلور سے آبگینہ کر دیتا ہے اور آبگینہ سے آتشیں شیشہ بنا دیتا ہے جب گرم شیشہ آتشکدہ سے باہر آتا ہے رقیق حالت میں ہوتا ہے اُس وقت آئینہ ساز اپنے "دم" سے جو صورت چاہتا ہے شیشہ کو عطا کرتا ہے اگر کسی پہلو آگ کی طپش اعتدال سے ذرا بھی زیادہ ہو جاتی ہے تو شیشہ گُھلا جاتا ہے اور اپنی صورت چھوڑ دیتا ہے مرزا شراب کو رنگ اور تاثیر کے لحاظ سے آتشِ گلخن کا مقابل بیان کرتے ہیں اور می کی حدت اور شدت کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ساغر کو گداخت سے بے صورت کئے دیتی ہے پھر کہتے ہیں کہ یہی حالت میرے دل کی ہے جو فکر اور اندیشہ کی آگ کی تاب نہ لا کر گُھلا یا جاتا ہے۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
(۸) کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

جب آفتاب راہرو کی پشت کی جانب ہوتا ہے تو سایہ سامنے پڑتا ہے۔ مرزا دوپہر کے قریب اپنے مقتل میں جانے کے متعلق اپنے شوق کو یوں بیان کرتے ہیں کہ میرا سر پاؤں سے دو قدم آگے آگے ہے۔ اس کیفیت کو ہر شخص نصف النہار کے بعد خود دیکھ سکتا ہے۔

رگِ پے میں جب اُترے زہرِ غم پھر دیکھئے کیا ہو
(۹) ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

قدرت نے قریب قریب جملہ مہلک سمیات کو تلخ بنایا ہے ہندوستان میں جو زہر زیادہ تر خودکشی کے لئے مستعمل ہیں وہ تیلیا، سنکھیا، دھتورا، افیون اور کچلہ ہیں یہ سب سخت تلخ ہیں اس لئے سب سے پہلی مشکل ان کا مُنہ تک لیجاتا ہے۔ زہر کا فعل معدہ کے فعل پر منحصر ہے اور دیر طلب ہے چنانچہ دورانِ سر، بردِ اطراف، امتلا

غثیان۔ جریان خون عطش ضیق النفس اور انقباض و تشنج جو موت کی علامات ہیں اُس وقت تک شروع نہیں ہوتیں کہ زہر سرایت نہ کر جائے۔ مرزا غم اور رنج کے اثر کا کیا خوب زہر سے مقابلہ کرتے ہیں آغاز میں غم صرف سخت تلخ معلوم ہوتا ہی لیکن انجام کار رفتہ رفتہ گھلا کر مار دیتا ہی۔

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہی مجھسے نہ ٹھیرا جائے ہی مجھسے (۱۰)

جنگ میں اس سے زیادہ کوئی مجبوری کا عالم نہیں جب تک گولی دل یا دماغ میں نہ لگے انسان کو لڑنے سے فوراً معطل نہیں کر سکتی۔ بسا اوقات جدید باریک کلاہ کی گولیاں فم معدہ میں ایک جانب سے دوسری جانب بلا تکلف شکم سے پشت کی طرف نکل جاتی ہیں اور سوائے خارجی خفیف زخموں کے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ غشاء معدہ کے سوراخ فوراً خود بخود مندمل اور بند ہو جاتے ہیں پھیپھڑوں میں۔ جگر میں گولیاں بعض مرتبہ محسوس بھی نہیں ہوتیں اور قریب قریب جزو بدن ہو جاتی ہیں لیکن وقت ہنگام پاؤں پر گولی کا لگنا غضب ہی نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

مرزا غالب نے میدانِ عشق میں بے بس ہو جانے کی کیا مثال دی ہے۔

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے (۱۱)

ہندوستان میں مغلوں کے زمانہ کے بہت سے باغات غیر آباد اور ویران پڑے ہیں سنگ مرمر اور سنگ رخام کی بارہ دریاں شکستہ افتادہ ہیں۔ جہاں شاہزادے اور بیگمات رہتی تھیں وہاں اب خبات اور پریوں کا مسکن ہی۔ جن روشوں پر کافوری شمعیں روشن رہتی تھیں وہاں اب جگنوں اُڑتے ہیں۔ نباتات نے دست انسانی کی قطع و برید سے آزادی پاکر ایک عجیب آوارگی اختیار کرلی ہی۔ پانی کے پاس درختوں کے سایہ میں جو پودے ہوتے ہیں وہ اکثر طویل اور نازک تن ہوتے ہیں جن کی شاخیں پتلی ہونے کے باعث پھول کے وزن سے بھی جھک جاتی ہیں اور ذرا سے ہوا کے جھونکے میں اِدھر سے اُدھر لہرانے لگتی ہیں۔ شام کے وقت ان شاخوں کا عکس سبزہ پر بعینہ سانپ کی طرح نظر آتا ہے۔ اگر طبیعت پر ما نیا یا وحشت یا ہول کا اثر ہو تو اس افعی سے ڈرنا کوئی عجب نہیں۔

(۱۲) نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ ۔ کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہی

بھلا اطبا سے علاوہ کون اس بات سے واقف ہو کہ زخم کے خراب ہو جانے کی علامت یہ ہو کہ اُس کے اندر ہوا نفوذ کر جاتی ہو جو زخم "سانس دینے لگتا ہو" ضرور مہلک ثابت ہوتا ہو۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے (۱۳)

مُرغ قفس کو کس نے نہیں دیکھا۔ کہاں فضائے نامحدود کہاں کنج قفس جس میں پروں کو پھیلانے تک کی جگہ مفقود چمن کی ہوا اور ہمدموں کی صدا تک نہیں آتی لیکن تقاضائے حیات پھر بھی نامشکور کوششوں کا خواستگار رہتا ہے جب "دانہ بدول" کا زمانہ آتا ہو تو گو محض تنہائی اور تجرد ہے اور تنکوں کا مہیا کرنا بے معنی لیکن خس قفس میں ضرور جمع کر لیتا ہو۔

(۹)

مرزا غالب کے کلام کی عجیب سادگی اور ہشیاری اور عجیب ترب بے خودی اور پرکاری انتہائے کمال ہے۔ بعض نقاد مرزا غالب یا ٹیگور کے کلام کی سادگی سے سخت مغالطہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں اُن کے خیال میں یہ بات آتی ہو کہ اس میں خوبی ہی کیا ہے ہر شاعر ایسا لکھ سکتا ہو۔ یہ ایک فریب ہو۔ ہر شخص اپنے ذہن میں یقین کرتا ہے کہ وہ اُن تمام اشیا کو جو اس کے پیش نظر ہیں خوب جانتا ہو اور ان کے من و عن بیان اور اظہار کی قابلیت رکھتا ہو حالاں کہ چند منتخب افراد کے سوا دنیا میں کوئی شخص اپنی گرد و پیش کی ادنی اشیا کی محض صورت سے بھی واقف نہیں یہی وجہ ہے کہ اگر اُس سے الفاظ یا رنگ یا آواز میں اُن کا نقشہ اُتارنے کو کہا جائے تو اس کے دعوے کا باطل ثابت ہونا اور اس کا قاصر رہنا قطعی ہو کیا قدرت کے نظارے اور عورتوں کے اجسام کو دیکھنے کی ہر شخص نگہ رکھتا ہو کیا گیوٹو (Giotto) اور لارن سے ٹی (Lorenzetti) کی سادہ تصاویر کا راز یہی ہے کہ وہ فن موقلم کشی اور رنگ آمیزی سے واقف تھے اور اگر تم کو یہ فنون بدرجہ کمال سکھا دیئے جائیں تو تم بھی ایسی تصویریں بنا لو۔ اس غلط اندازہ میں کبھی مبتلا نہ ہونا۔

جملہ فنون لطیفہ میں جن میں شاعری بھی شامل ہو بقول فرنسس ٹامپ سن (Francis Thompson) سادگی انتہائے اشکال ہو جب مُصور نقش نادر بت طناز کو حوالۂ تصویر کرنے کے لئے موقلم اُٹھاتا ہو یا شاعر اُس مضمون کو

جس کو ناواقف بزعم خود آسان جانتے ہیں ادا کرتا ہے تو بت یا مضمون مصوّر یا شاعر کے سامنے ایک نئی دنیا کی صورت میں نظر آتا ہی جس کو کولمبس (Columbus) کی مثال کوشش اور نہایت جستجو سے دریافت کرنا پڑتا ہی میکائیل آنجلو (Michael Angelo) کا قول ہی کہ تصویر ہاتھ سے نہیں بلکہ دماغ سے کھینچی جاتی ہے جب لیونارڈا دو ونچی (Leonorda de Vinci) سے خانقاہ ڈیلا گراطسیا کی (Delle Grazia) کے اسقف نے عشائے ربانی کی تصویر بنانے کے لئے کہا تو وہ کئی روز تک صبح سے شام تک اپنا موقلم ہاتھ میں لئے کھڑا رہا اور پردہ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہر تبسّم کو دیکھتے ہیں حالاں کہ ہم کو صرف ایک دھندلی سی کیفیت سے زیادہ دیکھنے کی قدرت نہیں سوائے ماہران فنون لطیفہ کے کوئی بھی عالم کے مظاہرات خارجی اور باطنی کو نہیں دیکھ سکتا اور اسی وجہ سے اُن کا اظہار نہیں کر سکتا۔

جب میں ذیل کی غزلوں کو دیکھتا ہوں تو مجھکو معاً ابن رشیق کا قول یاد آتا ہی۔

فَاِذَا قِیْلَ اَطْمَعَ النَّاسَ طُرًّا
وَاِذَا رِیْمَ اَعْجَزَ الْمُعْجِزِیْنَا

جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں مگر جب ویسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائیں۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی — کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکش سطح چرخ مینائی!
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی — سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی — سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے — چشم نرگس کو دی ہی بینائی
کون ہی جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی — ہی ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادہ پیمائی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی — کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالب — شاہ دیندار نے شفا پائی!!
جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب — کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی — کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی — موت کا ایک دن معین ہی — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
دیکھو اے ساکنان خطہ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی — آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ۔۔۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہی کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ۔۔۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سی ہم کو بھی ۔۔۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ۔۔۔ موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سی جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہی ۔۔۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہی
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ۔۔۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہی
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں ۔۔۔ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہی
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۔۔۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہی
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ۔۔۔ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہی
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہی ۔۔۔ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہی
سبزہ و گل کہاں سی آئے ہیں ۔۔۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہی
ہم کو اُن سے وفا کی ہی اُمید ۔۔۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہی
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا ۔۔۔ اور درویش کی صدا کیا ہی
جان تم پر نثار کرتا ہوں ۔۔۔ میں نہیں جانتا دعا کیا ہی
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہی

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی ۔۔۔ میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ۔۔۔ کچھ نہیں ہی تو عداوت ہی سہی
میری ہونے میں ہی کیا رسوائی ۔۔۔ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ۔۔۔ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ۔۔۔ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں ۔۔۔ نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف ۔۔۔ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ۔۔۔ بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

کوئی دن گر زندگانی اور ہی ۔۔۔ اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہی
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں ۔۔۔ سوزِ غمہائے نہانی اور ہی
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں ۔۔۔ پر کچھ اب کی سرگرانی اور ہی
دے کے خط مُنہ دیکھتا ہی نامہ بر ۔۔۔ کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہی
قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم ۔۔۔ وہ بلائے آسمانی اور ہی
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہی

اب سہل ممتنع سے قطع نظر مشکل اور غریب انداز پر غور کیا جائے تو دلچسپ تر صورت ہی۔ جو لوگ کہ گرم معتدل فرشِ ارض پر رہنے کے عادی ہیں وہ اُن لوگوں کی پاک اور خوف آمیز مسرت کو کیا جان سکتے ہیں جو فنونِ لطیفہ کی سرد اور بے داغ برف سے ڈھکی ہوئی مرتفع چوٹیوں میں گشت لگا رہے ہیں۔

کانٹ نے اپنی کتاب Kritik der reinen Vernunft Urtheilskraft میں خوب کہا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں جن میں "آزاد حسن" ہوتا ہے۔ وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی خوشبو سے مشام جان کو مسرور کرتے ہیں۔ اگر ان کے نثر کرنے اور اُن کے مطالب کے دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی غرض سے ان کے پتوں کو توڑ کر علیحدہ کرے۔ بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے اس کیفیت میں خواب کی سی حالت ہوتی ہے۔ خواب میں متخیلہ ادراک پر غالب آجاتی ہے اور عجیب پرلطف پریشان مطلب مظاہر پیش کرتی ہے۔

پال ورلین (Paul Verlaine) کی مشہور نظم "میرا خواب" (Mon reve familier) مرزا کے مفصلۂ ذیل قطعہ سے کس قدر مشابہ ہے۔

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب
شیشۂ مے سروِ سبز جوئبار نغمہ ہے

غالب نشہ کو نخل کی طرح "شاداب" اور ساز کو مے گسار کی طرح "مست" بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیشۂ مے سرود کے جوئبار پر ایک سرو سبز ہے۔

بودلیر (Baudelaire) لکھتا ہے کہ شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی الحس ہوجاتے ہیں۔ آنکھیں پردہ ابد تک دیکھنے لگتی ہیں۔ پُرشور مقامات میں خفیف سے خفیف آواز کو کان سننے لگتے ہیں اور شور سے بالکل ناآشنا رہتے ہیں۔ اختلال خیالات واقع ہوتا ہے اور جملہ اشیاء عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہوجاتی ہیں اور خیالات میں ناقابل حل اطلاقی تغیر پیدا ہوجاتا ہے آوازیں رنگیں معلوم ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں نغمہ پیدا ہوتا ہے۔

غالب کو نشہ شاداب اور ساز مست اور نغمہ آب رواں اور جام سرو سبز نظر آتا ہے۔ لیکن غالب میں یہ کیفیت ایک نہایت معتدل انداز اور صحیح حد تک ہے رمبو (Rimbaud) کی طرح اُس حد تک نہیں پہنچی کہ جس طرح حروف تہجی حروف کے اعداد میں معنی نہاں پاتے ہیں وہ ہر حرف میں ایک خاص رنگ پاتا ہے چنانچہ کہتا ہے۔

A noir, Eblanc, I rouge, U vert, O bleu, voyelles,

غالب کا اس انداز کا کلام سب سے زیادہ فرانسیسی شاعر ملارمین (Millarme) سے مشابہ ہے۔

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو — چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ — خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

بجا ہے گر نہ سنے نالہائے بلبلِ زار — کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا — ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

میکدہ گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست — موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی — ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

لیکن شاعرانہ جذبہ اور وجدان میں ایک ایسی کیفیت بھی واقع ہوتی ہے جس کو سرمستی سے مترادف کہا جا سکتا ہے جس میں شاعر آفتاب اور ماہتاب کو اپنے کفِ دست میں اٹھا لیتا ہے۔ اس بے خودی کے عالم میں مرزا نے کلام موزوں کیا ہے۔

مرزا کی دیوانگی جرمن دیوانے شاعر الفرڈ مام برٹ (Alfred Mombert) سے کچھ کم نہیں۔ ممبرٹ اپنے جنون میں کہتا ہے۔

DA Mond und Sonne dir ewig kalt ist, und dir das Sternengewoelbe ewig alt ist, und in der Finsternis zerreisst dein Gang Lausche meinem Geasang

مرزا فرماتے ہیں:۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادباں

مرزا اور مام برٹ دونوں ظلمات کی تاریکی میں داخل ہوئے ہیں اور سکندر کی آخری منزل سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن مرزا صحیح سلامت خضر کی طرح واپس آگئے ہیں اور وہ غریب ہمیشہ کے لئے وہیں رہ گیا ہے۔

فریڈرش نطشے اپنی تصنیف "بقول زردشت" میں لکھتا ہے "میں شعرا سے تنگ ہوں۔ قدیم شعرا سے اور جدید سے

وہ سب پایاب پانی میں ہیں۔ ان کی مثال خشک دریاؤں کی سی ہے ان کا تخیل تعمق سے خالی ہے۔ ان کے احساسات سطحی ہیں تعیش اور رندی کے چند جذبات کے سوا ان کے دیوانوں میں کچھ نہیں"۔ میرزا کی شاعری اس الزام سے مطلق بری ہے۔ غالب کا دل ایک آئینہ ہے جس میں ہر مظہر الٰہی اور منظرِ قدرت کا جلوہ موجود ہے اس کی زبان ترجمان حقیقت ہے۔ اس کے پرکارِ تخیل کا دائرہ دائرۂ امکان سے ہمکنار ہے۔ عالمِ کون و فساد میں ایک ذرہ کی جنبش بھی اس کے حلقۂ غور سے باہر نہیں ہے۔ غالب ایک فلسفی ہے جو شاعری کا جامہ زیبِ تن کئے ہوئے ہے۔

غالب وحدت الوجود کے قائل ہیں وہ خدا کو ماسوا سے علیٰحدہ نہیں خیال کرتے بلکہ اُن کا مذہب ہمہ اوست ہے۔ فلسفہ میں کوئی سوال اس سے زیادہ مشکل نہیں کہ دُنیا کی آفرینش کس وجہ سے ہوئی ہے۔

غالب اس کا جواب دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں

مبدأ عالم حُسن ہے اور حُسن کو تقاضائے اظہار ہے اس لئے دُنیا عدم سے وجود میں آئی ہے دنیا ایک آئینہ ہے جس میں حُسنِ ازل خود بیں ہے یہ خیال مرزا غالب کا اپنا خیال نہیں ہے بلکہ اسلامی تصوف کا عقیدہ ہے مگر جس خوبی کے ساتھ مذکورۂ بالا شعر میں مرزا غالب نے اس کو ظاہر کیا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے علاوہ کسی نے اس خوبی سے اس کو[1] نظم نہیں کیا۔

اہلِ تصوف نے اس راہ کو جو طالب کو مطلوب حقیقی تک لی جاتی ہے۔ تین عوالم یا سات واسطوں میں تقسیم کیا ہے ابتدائی عالم عالمِ ناصوت ہے اس میں ذہن اسرار ہستی کے رازوں کی عقدہ کشائی کرتا ہے اور عقل راہ معرفت کا راستہ دکھاتی ہے۔ غالب عالم ناصوت میں کہتے ہیں۔

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے طاقت کہاں کہ دید کا احسان اُٹھائیے

مادہ خود بے جان اور جامد ہے جو چیز مادہ کو تحریک و جنبش میں لاتی ہے وہ حرکت ہے مگر حرکت خود اپنی ذات سے آفرینش کی قدرت نہیں رکھتی جب تک کہ متعین نہ ہو اگر حرکت میں قاعدہ نہ ہوتا تو دنیا عالم فساد سے عالمِ کون میں نہ آسکتی پس علت العلل وہ ذات یا طاقت ہے جو حرکت کے پس پشت حرکت کو تعین دیتی ہے۔

---

[1] در بیان آں کہ ہر یک از جمال و عشق مرتبیست از آشیانۂ وحدت پریدہ در شاخسار مظاہر کثرت آرمیدہ (یوسف زلیخا صفحہ ۲۰)

ہی کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتوسے آفتاب کے ذرہ میں جان ہے

ہی تجلی تری سامان وجود!!! — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

عالم جبروت سے عالم لاہوت کا راستہ وادیٔ تحیر میں سے ہی۔ العلم حجاب اکبر۔ جس قدر علم میں زیادتی ہوتی جاتی ہی ماہیت سے بُعد ہوتا جاتا ہے۔ شرارہ کا عریان آنکھ سے نظارہ کرنا اور اُس سے واقف ہونا آسان ہی لیکن اگر طاقتور خوردبین سے اُس کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ ایک آتشکدہ معلوم ہوگا جس کی کیفیت کو مطالعہ کرنا ناممکن ہی جس قدر حقیقتِ عالم پردہ سے روشنی میں آتی جاتی ہی دماغ عاجز ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک مدام حیرت اور استغراق کا عالم طاری ہو جاتا ہی۔ مرزا غالب نے اپنی اس کیفیت کو جس خوبی سے اپنے کلام میں بیان کیا ہی اُس کی مثال موجود نہیں۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہی — حیران ہوں پھر مشاہدہ ہی کس حساب میں

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہی

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہی

شکن زلف عنبریں کیوں ہے — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہی

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہی

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے — پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہی

ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہی

ہستی ہی نہ کچھ عدم ہے غالب

آخر تو کیا ہے اے نہیں ہی

وادیٔ حیرت کا راستہ نہایت پرخطر ہی۔ بہت سے طالب حقیقت اس سے آگے نہیں پہنچ پاتے۔ یہ سراب اور تشنہ لبی کی کیفیت ہی۔

صفائی حیرتِ آئینہ ہی سامانِ زنگ آخر — تحیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہی رنگ آخر

لیکن جو اہلِ ظرف ہیں وہ بدیر و بدقت اس وادی کو طے کر جاتے ہیں۔ مرزا غالب اس کیفیت کو جب یہ حجاب

اُن کی نگاہ سے رفتہ رفتہ اُٹھ رہا ہے یوں بیان کرتے ہیں۔

کثرت آرائیِ وحدت ہی پرستاریِ وہم　　کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

آہستہ آہستہ معلوم ہونے لگتا ہی کہ یہ ہنگامہ یہ پری چہرہ لوگ یہ غمزہ و عشوہ و ادا یہ شکنِ زلف عنبریں یہ نگہ چشم سرمہ سا یہ سبزہ و گل یہ ابر و ہوا اصنام خیالی ہیں۔ اس کثرت کا تسلیم کرنا پرستارئے وہم ہی حقیقت سب کی وحدت ہی جب طالب حقیقت سے دوچار ہو جاتا ہی تو من و تو کے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور اللہ اور غیر اللہ کا فرق باقی نہیں رہتا۔

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے　　کام اچھا ہی وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

منصور کا انا الحق پکارنا اور بایزید بسطامی کا یہ کہنا کہ خدا میرے ملبوس میں ہی، اسی کیفیت کا ثبوت ہی سرمد کی طرح مرزا غالب کہتے ہیں۔

جلا دسے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے　　ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

وحدت الوجود کا مسئلہ تصوف سے مخصوص نہیں۔ معتزلہ کا بھی یہی مذہب ہی۔ غیلان دمشقی۔ واصل ابن عطا عمر بن عبید۔ مادہ روح اور خدا تینوں کو ازلی اور ابدی خیال کرتے ہیں۔ خود فلسفۂ قدیم اور جدید میں یہ ایک معرکتہ الآرا مسئلہ تسلیم کیا جاتا ہی۔ فلسفے کے جملہ مدارس دو فریق میں تقسیم ہیں۔ وحدت الوجود کے قائل کہتے ہیں کہ تمام عالم مادی کو اگر تحلیل کیا جائے تو ایثیر رہ جاتا ہی اور ایثیر خود تحلیل ہو کر خیال اور خیال تحلیل ہو کر صرف مسبب الاسباب باقی رہتا ہی۔ افعال کی نیکی اور بدی محض تعلق مادی کی وجہ سے نظر آتی ہی ورنہ جو شے ایک کے خیال میں نیک ہے وہی دوسرے کے خیال میں بد ہی۔ بالذات نیکی اور بدی کا وجود نہیں توحید کے قائل خدا کو خالق اور ماسوا کو مخلوق خیال کرتے ہیں۔ خدا دنیا سے بے تعلق اور آزاد ہی۔ ثنویت کے پیرو نیکی اور بدی کو اہرمن اور یزدان کی مثال ہمیشہ مصروف پیکار بتلاتے ہیں۔ مادہ اور روح کو متحد الذات نہیں بلکہ مختلف الذات کہتے ہیں۔

جدید ترین فلسفہ اور حکمت کی تحقیقات وحدت الوجود کی طرف مائل ہی (Spinoza) کا قول نہایت مسلّم ہی وہ کہتا ہی

حکمت میں ہیکل (Heckel) کا فلسفہ ان الفاظ میں بیان ہو سکتا ہی "یہ عالم کا تمام نقد و نسیہ ایثر ہی۔"

موجودہ زمانہ کی سب سے بڑی تحقیقات مسئلہ ارتقا ہے اگرچہ مسلمانوں کی کتب ماضیہ میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے اور الفارابی بوعلی سینا اور خصوصاً الحسن کے نام سے منسوب ہی اور بغداد کے کتب خانہ کی تباہی کے باوجود خلاق نظری رسائل اخوان الصفا۔ فوز الاصغر۔ مثنوی معنوی وغیرہ میں اس کا ثبوت موجود ہے لیکن واقعات کے لحاظ سے اس کا فخر زمانہ جدید ہی کو حاصل ہی۔ ڈارون اور مرزا غالب ہم عصر ہیں گو دونوں کو ایک دوسرے کا کچھ بھی علم نہ تھا مسئلہ ارتقا کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہی کہ ڈارون (Darwin) سپنسر (Spencer) رسل والس (Wallace) ہیکل (Heckel) وائزمن (Weismann) منڈل (Mendel) وغیرہ نے تقریباً ایک ہی وقت میں ایک دوسرے سے آزاد طور پر اس کا پتہ لگایا۔ میری رائے یہ ہی کہ ہر عہد کی ایک روح العصر ہوتی ہی جس کو المانی (Zeitgeist) کہتے ہیں وہ روح القدس کی طرح حسب ضرورت زمانہ انسان کو تعلیم دیتی ہے مرزا غالب نے بھی مسئلہ ارتقا کو پہچانا ہی۔

لوٹ زے (Lotze) کا بیان ہی کہ عالم کی یہ کیفیت ہی جس طرح بیج رفتہ رفتہ منازل بہ منازل نمو پذیر ہوکر تناور درخت ہو جاتا ہی یہ "جان عالم" ہے۔

فان ہارٹ مان (Von Hertmann) کا قائل ہے زمانہ جدید کا سب سے بڑا فلسفی برگسان (Elan de vie Bergson) کو جانتا ہی اور کہتا ہے کہ حیات جو تمام عالم میں جاری اور ساری ہے بالذات آمادۂ ارتقا ہی۔ دنیا برابر تکمیل پا رہی ہے اور منتظر ہی۔ مرزا غالب نے اس بات کو کس نزاکت سے کہا ہی:-

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یعنی معشوق عالم جو موجودات کے نقاب میں پنہاں ہی برابر اپنی جمال آرائی میں مصروف ہے اور آئینہ نقاب ہی میں لئے ہوئے اپنے غازہ کو درست کر رہا ہی جب عالم تکمیل کو پہنچ جائیگا تو نقاب الٹ دے گا عالم کو دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہی کہ ابھی کسی چیز کی کمی ہی شش جہت آراستہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں -

کس کا سراغ جلوہ ہی حیرت کو اے خدا آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

(۱۱)

غالب عالم کو مایا خیال کرتے ہیں

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے — ہوتا ہی شب و روز تماشا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

یہ اپنشدون کی قدیمی تعلیم ہے لیکن ہندو عام طور پر اس کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ عالم کا وجود ایک فریب نگاہ ہی۔ ایک دشت کسراب ہی جو خواب میں نظر آتا ہے۔ ایک خواب ہی جو چشم کور عالم رویا میں دیکھتی ہی۔ مرزا غالب کی حقیقت بین عقل اس مغالطہ سے آزاد ہی۔ غالب لفظ ہستی کو ہمیشہ مادہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ مادہ کے منکر ہیں۔ عالم گو اجسام خارجی سے مملو نظر آتا ہے اور غایت لطیف فازیات سے لے کر غایت گراں فلزات تک عناصر سے پُر ہی۔ مادّہ کا وجود محض بالنسبت ہی بالذات نہیں۔ زندگی کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویریں حرکات اصوات الوان۔ کوئی وجود نہیں رکھتیں جب تک کہ ذہن اُن کا ادراک نہ کرے۔ وجود کی بنا تصور پر ہی۔ یہ تصور کوشش سے آزاد ہوتا ہی۔ بعض نے اس پر یہ اعتراض عائد کیا ہی کہ فرض کرو کہ ہم اپنے دوست کو جو موجود نہیں اپنے پہلو میں موجود تصور کریں تو اس فلسفہ کی رُو سے اُس کا غائب اور حاضر ہونا مساوی ہے اس کا جواب یہ ہی کہ متخیلہ کی مدد سے کسی تصور کا قایم رہنا ایک مدام اور متصل کوشش پر منحصر ہی جب تک تم اپنے دوست کا خیال کرتے رہوگے اور جتنی تکلیف اور محنت سے تخیل کو کام میں لاؤگے وہ نقش قایم رہیگا۔ جہاں خیال اُس نقطہ سے آوارگی اختیار کرے گا نقش محو ہو جائیگا بخلاف اس کے موجود اشیا کا تصور کوشش سے آزاد ہی۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جائے گا کہ اگر تمہارا فلسفہ یہ ہی کہ تمہارے وجود سے عالم مادّی کا وجود ہی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمہارا خاتمہ خود دنیا کو ختم کر دے گا اس کا جواب یہ ہی کہ "انا" نے جہاں مادہ کو اپنے تصور سے قایم کیا ہی وہیں یہ بھی معلوم کیا ہی کہ خود اُس سے مماثل اور بہت سے "انا" موجود ہیں جو میری طرح سے فاعل اور مختار ہیں۔ بہت سے مظاہر جو اس کے اثر اور اقتدار سے باہر ہیں اُن کے اثر اور اقتدار میں ہیں۔

تمام مادّہ جس میں خود میرا جسم اور اور بنی نوع کے اجسام شامل ہیں بے جان اور بے کار ہی وہ رُوح وہ رواں وہ خیال جو ان پر فاعل ہی حقیقت ہی۔

غالب کا فلسفہ سپی نوزا (Spinoza) ہیگل (Hegel) برکلے (Berkly) اور فشطے (Fichte) سے ملتا ہی۔

حکمت کی رُو سے بھی مرزا غالب کا خیال صحیح ہی مادہ سالمات سے مرکب ہی۔ اگر پانی کے ایک قطرہ کو کرۂ ارض کے

برابر خیال کریں تو اس کے سالمات چوگان کے گیند سے بڑے نہ ہوں گے یہ تمام سالمات رقصان حلقوں کی مثال ہیں۔ سالمات اجزا سے مرکب ہیں جواب لایتجزیٰ خیال نہیں کئے جاتے بلکہ جواہر برق سے مرکب مانے جاتے ہیں۔ ہر جزو کو اگر ایک کلیسا سے مشابہ خیال کریں تو بقول سر آلیور لاج (Lodge) یہ جواہر کلیسا میں اڑتی ہوئی کھیوں کی مثال ہیں۔ اگر ان کو تخیل پھر تحلیل کرے تو ان کی ساخت حلقہائے ایثر سے ہوئی ہے اور اگر ایثر کے حلقوں کی گرہ کھل جائے تو محض خیال باقی رہ جائے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

وہ کیا چیز ہے جس نے خیال کو جو حقیقت میں اپنی کل میں ذات باری ہے اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ مایا کے مختلف مادی لباسوں میں درجہ بدرجہ جلوہ گر ہوتا ہے۔ جمال الٰہی اگر بہ تقاضائے اظہار حسن وجود چاہتا ہے تو وجود مادی کیوں اختیار کرتا ہے اس کا جواب مرزا غالب کے سوا آج تک دنیا کے کسی فلسفی نے نہیں دیا اور وہ جواب یہ ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

یہی باعث ہے کہ بقول اسپنسر (Spencer) مادہ متحد الجنس اشیا سے مختلف الجنس اشیا کی تکوین کے لئے ایک آزاد حالت سے لازب کیفیت کی طرف چلتا تھا۔ عالم حیوانات میں جان دار جس قدر سادگی سے بناوٹ کی طرف بڑھتے ہیں اور اعلیٰ مدارج پر آتے ہیں "گل حکمت" کے خمیر میں کثافت زیادہ ہوتی جاتی ہے یہی باعث ہے کہ شاعر کے دل کو اپنی کھوئی ہوئی لطافت کے حاصل کرنے کے لئے غم کی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔

غالبؔ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جو حدود کے قائل ہیں اور اُن کے سامنے اظہار عجز کر کے رُک جاتے ہیں وہ لاادریہ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ حقیقت عالم پردۂ غیب میں نہاں اور پنہاں ہے اور علم کے احاطہ سے باہر ہے۔ وہ حافظ کی طرح بیچارگی کا اظہار نہیں کرتے ع

ایں راز نہان ست و نہاں خواہد ماند

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ دل دانا اور چشم بینا کے لئے کوئی راز نہیں ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

گوش شنوا کو ہر وقت پیغام حقیقت پہنچتا رہتا ہے۔

عالم کا کون وفساد دن رات ہماری آنکھوں کے سامنے واقع ہوتا ہے۔ جو عالم سکون میں نظر آتا ہے وہ بھی چشم بینا کو مبتلائے فساد دکھائی دیتا ہے۔ ع

غنچہ تا شگفتہا برگ عافیت معلوم

باوجود دلجمعی خواب گل پریشاں ہے اور جو عالم ارتعاش کیف اور تحریک میں دکھائی دیتا ہے وہ بھی بستہ زنجیر کون ہے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی　　ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

یہ کون وفساد کا نقشہ صاف بتلاتا ہے کہ کوئی صورت نگار اس پردہ کے عقب میں موجود ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

جب میں مرزا غالب کی طبیعیات الٰہیت پر غور کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔ یہ فلکیات کی ایک جدید ترین تحقیقات خیال کی جاتی ہے جو مشاہدہ سے زیادہ ریاضی کے تخمینوں پر مبنی ہے کہ اگر ہم فضائے سماوی کے سب سے آخری ستارے اور سیارہ تک پہنچ جائیں تو وہاں سے آگے بھی ویسے ہی ستارے اور سیارے نظام ہائے شمسی قنوان وغیرہ موجود ہیں۔ آباد فضا بھی بے اندازہ ہے اور نہیں معلوم کہ خلا، ایثر کہاں شروع اور ختم ہوتا ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

نہ معلوم یہ خیالات مرزا غالب نے مجسطی، مسعودی اور عمر خیام کے مطالعہ سے اخذ کئے یا وہ اپنا وقت دہلی کے جنتر منتر میں گزارا کرتے تھے اور ہمایوں کی طرح (جو ستارہ بینی میں مرزا) فلک پیمائی کیا کرتے تھے۔ یا علم ریاضی کے ذریعہ اُنھوں نے اس کا پتہ لگایا یا اُن کی نگاہ تخیل خود فضا پیما تھی۔ کانٹ (Kant) لاپلاس (Laplace) اور ہرشل (Herschel) اور اُن کے جانشینوں سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ نظام ہائے فلکی کی آفرینش ایثر سے اس طرح ہوئی ہے جس طرح کسی خراد پر سے ٹکڑے جو گردیت میں حائل ہوتے ہیں ٹوٹ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں یا جیسے کوئی کسی چیز کو پھینکتا ہے مرزا غالب کو خورشید کی نسبت یہ کہاں سے معلوم ہوا۔

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے　　خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

جس شخص کی نگاہ سے ستاروں کی آفرینش مخفی نہ تھی اس کے لئے جغرافیہ کی جدید تحقیقات کیا حقیقت رکھتی ہے

بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

(۱۲)

مرزا غالب کی عبادت گاہ عرش و کرسی کے سایہ میں ہی۔ وہ تسبیح جس پر وہ اسمارِ الٰہی کا وظیفہ پڑھتے ہیں صد ہزار دانہ ہی اور وہ دانے اجرام فلکی اور اجسام سماوی ہیں۔ کعبہ اور دیر کلیسا اور کنشت اس رفیع بارگاہ سے یکساں نظر آتے ہیں جہاں عوام و خواص کا مذہب منتہی ہو جاتا ہی مرزا کا مذہب آغاز ہوتا ہی۔

قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں ہی پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

ذات خداوندی گو جملہ مذاہب کا مقصود ہی خدا تعالیٰ خود طریق و ملّت کی قید سے مبرّا ہی۔ مرزا غالب بھی کسی ارضی مذہب کے پابند نہیں بلکہ۔

I sit as God holding no form of creed
But contemplating all

اُن کو ہر مذہب کا اس قدر پاس ہی کہ اُنھوں نے سب میں شرکت کی خاطر تمام کی ظاہری رسوم کو جو باعث امتیاز ہیں ترک کر دیا ہی۔

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہی ترکِ رسوم ملّتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

اُن کی طلب اور آرزو دوزخ کے عذاب کے خوف اور جنّت کی لذات کے حرص سے آزاد ہے۔

ستائشگر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا وہ اِک گلدستہ ہی ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

جنت فی الحقیقت عوام کے لئے ایک خوش آیند خیال ہے۔

ہم کو معلوم ہی جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہی

حقیقی بہشت قرب الٰہی اور حقیقی جہنم بعد خداوندی ہے۔

سنتے جو ہیں بہشت کی تعریف سب درست لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

اگر جنت کی ہوا و ہوس دوزخ کا خوف و ہراس دل پر غالب ہو تو عبادت عین معصیت ہی یہاں تک کہ اگر طالب کو یقین ہو کہ اُس کی مناجات درجہ قبول ضرور حاصل کرے گی تو یہ خیال ہی سجدۂ نیاز کو باطل کر دینے کے لئے کافی ہی۔

گر تجھکو ہی یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

جنت اور دوزخ اور اُمید و بیم مانع عشق حقیقی اور معرفت ایزدی ہیں۔ اللہ اکبر کس مقام پر نشستہ ہیں جہاں سے یہ

فتویٰ صادر فرمایا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ۔ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اس پایہ کے لوگ جب سفر کعبہ کو نکلتے ہیں تو کعبہ خود اُن کے استقبال کو آتا ہے۔ اس جادہ پیمائی کا جو سفر نیاز میں ہے ایک قدم اس تمام زندگی کی مسافت سے جو سفر نماز میں ختم ہو زیادہ ہے ایسے آوارگان کوی صنم کی خودرائی کا کیا کہنا ہے عمر خیام کہتے ہیں کہ جب قیامت میں مجھسے سوال ہوگا تو میں کہوں گا ع

ایں رابہ کسے بگو ترا نہ شناسد

مرزا غالب جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم ۔ اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

کیا عجب ہے کہ حضور داورِ محشر میں یہ عرض کریں۔

آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد ۔ مجھسے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

جو عبادت اس درجہ پر پہنچاتی ہے وہ قید کفر و دین سے آزاد ہے وہ عشق کامل ہے۔

وفاداری بہ شرطِ استواری عین ایماں ہے ۔ مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

(۱۳)

انسان کی اصل مرزا کے خیال میں علت العلل سے ایک ہے اور حیات اُس کا اپنے مبدا سے جدا ہو کر دنیا میں آنا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۔ ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

انسان کا عدم سے وجود میں آنا بحر سے قطرہ ہو جانا ہے۔

مولانا روم نے فرمایا ہے کہ میں "نے" ہوں جس میں وہ سرود نواز عالم صوت سرمدی دم کرتا ہے۔

از نیستاں تا مرا ببریدہ اند ۔ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مرزا غالب کہتے ہیں۔

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

مرزا غالب کا فلسفۂ حیات ابن رشد سے مشابہ ہے۔ اندلسی فلسفی نے بیان کیا ہے کہ مادہ ہمیشہ ہیولیٰ کا محتاج ہے۔ بے صورت مادہ کا تصور ناممکن ہے۔ ہیولے ارواح کی طرح مادہ سے صورت آشنا ہونے کے لئے پریشان علیحدہ تصور میں نہیں پھرتے بلکہ مادہ سے یکجاں ہیں۔ مادہ چوں کہ سافل ہے۔ مادہ کے جزو حیات ہونے سے کثافت اور خرابی عالم اجسام میں راہ پاتی ہے۔ مادہ کے ذریعہ زوال اور انحطاط ابتدا ہی سے جزو بدن ہو جاتے ہیں۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی　　　　ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا　　　　اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا۔

وہ شئے لطیف جو مادہ کی آمیزش سے حیات کو تکمیل (Entelechia) دیتی ہے روح ہے روح مادہ کے محبس میں اسیر ہونے سے گھبراتی ہے اور اپنے ماضی کو یاد کرکے فریاد کرتی ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　　　　گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے　　　　جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

لیکن یہ روح اور مادہ کا امتیاز حقیقت میں ایک فریب خیال ہے ورنہ مادہ محض مایا ہے جب ادراک کامل و عطا ہو جاتی ہے تو مادہ کی غیریت خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بعد ہے　　　　جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

جو رازِ عالم سے آگاہ ہو جاتے ہیں وہ آلام اور تکلیف نہیں پاتے اور شکایت نہیں کرتے۔ بلکہ فلسفۂ غم فلسفۂ حیات کے ہم معنی اور مترادف ہو جاتا ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

عیش و نشاط دنیا کمزوروں اور کم ظرفوں کا حصہ ہیں جو رندان آتش نوش ہیں اُن کے لئے شراب غم مخصوص ہے جو کیفِ رنج سے معمور ہے۔

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا　　　　پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

پوچھی ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا　　　　آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

جمال ایزدی غایت خوب ہی مگر جلال بنی جس کے ہیبت انگیز جلوہ کی نہ موسیٰ اور نہ طور تاب لا سکے کمال حسن ہی۔ ٹیگور کہتے ہیں۔

"خوبصورت ہی ستاروں سے آراستہ مختلف رنگ کے جواہرات سے جڑا ہوا تیرا کنگن۔ لیکن میرے لئے تو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہی تیری تلوار۔ محترم طائر وشنو کے پھیلے ہوئے بازو کی طرح بجلی کا سا خم رکھنے والی تلوار۔ غروب آفتاب کی غصہ ناک سرخ روشنی میں پوری طرح تلی ہوئی تلوار۔

وہ کانپتی ہی جیسے موت کے فیصلہ کن ضرب پر شدت درد میں زندگی کا آخری جواب۔ وہ چمکتی ہی جیسے اک خوفناک چمک کے ساتھ دنیاوی حس کا جلا دینے والا پاک شعلۂ ہستی۔

خوبصورت ہی تاروں جیسے جواہرات سے مزین تیرا کنگن۔ لیکن تیری تلوار کی ساخت میں اے گرج کے مالک۔ کمال حسن صرف ہوا ہی۔ جو بصارت و تخیل (دونوں) کے نزدیک مہیب ہی۔"

یہی باعث ہی کہ مرزا غالب نے افلاطوں کے اُستاد سقراط کی مثال تلخ زہراب کو ہمیشہ نوش شیریں پر ترجیح دی غالب کا علم الاخلاق جاں سپاری ہی اور ع

جاں سپاری شیحرِ بیدِ نیس

(۱۴)

مرزا غالب ان تابوت بر دوش فلسفیوں میں نہیں ہیں زندگی کو ماتم خانہ اور راہل دنیا کو اہلِ جنازہ خیال کرتے ہیں وحدت الوجود کے فلسفہ کا پہلا سبق یہی ہی کہ ماسوا اور خدا جو صرف عارضی طور پر جدا ہیں اور بعد الموت پر یہ جدائی ختم ہو جاتی ہی۔ ع

عشرتِ قطرہ ہی دریا میں فنا ہو جانا

انسان خود کو اپنی غلط بینی سے اور افراد سے علٰحدہ اور اپنے ماحول سے جدا خیال کرنے لگتا ہی اور یہ خیال کرتا ہی کہ میں دنیا میں اجنبی ہوں اور مخالف اشخاص اور قوانین سے گھرا ہوا ہوں لیکن انسان اور علاوہ میں حقیقت میں کوئی رخنہ حائل نہیں ہی یہاں تک کہ موت بھی اُس میں رخنہ پیدا نہیں کرتی۔

اپنشدوں میں لکھا ہی:۔

مُوت اور بقا اس کا سایہ ہے "موت اور حیات میں کوئی فرق نہیں نہ تضاد ہی۔ بلکہ حیات ہی موت ہے حیات کی آمد زندگی اور رفت موت ہی۔ موت حیات عارضی کو دائمی کر دیتی ہے۔

فنا کو سونپ اگر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا ‏ ‏ فروغ طالع خاشاک ہی موقوف گلخن پر

عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا مت پوچھ ‏ ‏ عید نظارہ ہی شمشیر کا عُریاں ہونا

جان دی۔ دی ہوئی اُسی کی تھی ‏ ‏ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نظر میں ہی ہماری جادۂ راہِ فنا غالب ‏ ‏ کہ یہ شیرازہ ہی عالم کے اجزائے پریشاں کا

مرزا غالب موت کے مقابل ہیں خائف بچّہ کی مثال نہیں ہیں وہ اُن میں نہیں ہیں جو جس قدر موت کے خیال سے خالی الذہن ہونا چاہتے ہیں اُتنا ہی خیال مرگ اُن کو ستاتا ہی۔ موت کا خوف خوفکرنے سے بڑھتا ہی۔ موت کو خواہ مخواہ سخت بنا رکھا ہی بیکن کا قول ہی:-

Pompa mortis magis terret quam more ipsa

لیکن موت بھاری نہیں۔ موت سے زیادہ سہل کوئی اور چیز نہیں۔

ہی نو آموز فنا ہمت دشوار پسند ‏ ‏ سخت مشکل ہی کہ یہ کام بھی آساں نکلا

موت سے انسان کے گھبرانے کی وجہ یہ ہی کہ اُس کو یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ کہیں اختتام زندگی چراغ شخصیت کو ہمیشہ کے لئے گُل نہ کر دے۔ لیکن جیسا کہ ماٹرلنک (Maeterlinck) نے بیان کیا ہی ہستی محض یادوں کا مجموعہ ہی۔ جو چیز ہمیں تمام علاوہ سے ایک عارضی امتیاز دے رہی ہی وہ چند یادوں کے اجزائے پریشان ہیں اور یہ عارضی امتیاز ایسا عارضی ہے کہ "نشہ مے" عالم خواب" "جنوں" "صدمات عارضی" "رُویا" تک میں قایم نہیں رہتا یا منقلب ہو جاتا ہی۔ مرزا غالب اس خوف میں مبتلا نہیں ہیں بلکہ اُن کی سکون طلب طبیعت کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں احیای بعد الموت بھی ایک تنازع البقا اور کون و فساد ہی نہ ہو۔

وا ں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا ‏ ‏ لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

موت سے زیادہ گوارا کوئی پیند نہیں۔ سکرات اور نزع تو زندگی کا جانا ہی موت کا آنا نہیں موت تو تمام تکالیف ارضی کو ختم کر دیتی ہی۔ آلام جسمانی سے نجات دلاتی ہی اور عذاب روحانی سے آزاد کرتی ہی۔ بلاغ عالم میں افراد انسان کی

مثال ہیں بہت سے ترش ہوتے ہیں جن کو تا ختم بہار پختہ ہونے کے لئے انتظار کرنا پڑتا ہی بعض شیرینی کو پا ہی نہیں سکتے اور محض بزدلی کے باعث اپنی شاخوں کو خیرباد نہیں کہتے۔ بعض اپنی گرانباری سے شاخوں کو توڑ دیتے ہیں۔ بعضوں کو ہوائے تند خراب کر دیتی ہی۔ بعض کو خار یا طائر رات کو کھا جاتے ہیں۔ بعض کے قلب میں دیدان گھر بنا لیتے ہیں بعض کا رنگ خوبصورت ہوتا ہے لیکن حلاوت سے عاری ہوتے ہیں۔ بعض گو خوشبو رکھتے ہیں ذائقہ اُن کا تلخ کام کرتا ہے بہت سے بچے ضعیف پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سے ضعیف تادم گور بچے ہی رہتے ہیں۔ بعض جوانی میں سر سفید ہو جاتے ہیں بعض پیری میں بھی سر سیاہ دنداں سفید رہتے ہیں۔ لیکن موت کے آرام کی سب کو ضرورت ہوتی ہی۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی　　میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

سپاہی اپنی موت تلوار سے چاہتے ہیں۔ منجم پہلے ہی اپنے آخری وقت سے مطلع ہونا چاہتے ہیں۔ شعرا فصل بہار میں غنچہ ریز مولسریوں میں دب کر مدفون ہونا پسند کرتے ہیں لیکن یہ سب خامی ہی۔ جو اہل ظرف ہیں ان قیود کے قائل نہیں۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ　　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

موت کے بعد جسم محض ایک کالبد ایک نشان زندگاں سے زیادہ نہیں۔ روح کا چلا جانا اصلی واقعہ ہے جسم کا رہ جانا اس سے زیادہ نہیں جیسے کہ گل کی پریشان پنکھڑیاں خشک ہو کر گر پڑتی ہیں جس طرح صبا گلاب کی پتیوں کو اُڑا اُڑا کر ڈھیر یا لگا دیتی ہی اور کہاں سی کہاں لیجاتی ہی اس جسم کو بھی ہونا چاہیئے۔ اس کو مضبوط اور قیمتی صندوقوں میں سجانے آگ کے مقدس شعلوں کے نذر کرنے کی کیا ضرورت ہی سب سے بہتر یہ ہے کہ شراب ساز کو دیدیا جائے کہ وہ اسے بادہ میں آغشتہ کر کے اس سے پھر جام طیار کرے یا گلیوں میں تشہیر کیا جائے تاکہ ایک آخری کام اس سے بھی سرانجام ہو

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں　　جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تھا

(۱۵)

خندہ کیا ہی؟ ارسطو کے زمانہ سے آج تک فلسفی اِس مسئلہ پر غور کرتے آئے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں کانٹ (Kant) اسپنسر (Spencer) ہیکر (Hecker) کریپلین (Kraeplin) بین (Bain) لپس (Lipps) میرے ڈتھ (Meredith) اور برگسان (Bergson) نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے اور عجیب اور نادر نکات پیدا کئے ہیں۔

قہقہہ ہمیشہ مجلسوں میں بلند ہوتا ہے۔ جہاں گرم صحبت نہیں یہ ساز محفل بھی نہیں اسی ہی وجہ سے لکھنؤ کے قیصر باغ کے عیاشانہ جلسوں کے رند۔ انشا اور جرأت اور آگرہ کی برج کی ہولیوں کے کنہیا۔ نظیر کے قہقہوں کی آواز آج تک بلند ہے اور میر تقی، میر درد اور غالب کے کلام میں جو دنیا سے نفور اور ہنگامۂ عالم سے دُور رہنے والوں میں ہیں کمال سنجیدگی اور خاموشی کا اثر ہے۔

قہقہہ قدرت کا غلبۂ نفس کو دُور کرنے کا ذریعہ ہے یہ صحت بخش ضرور ہے لیکن خود اخلاط کی زیادتی اور مرض کی علامت ہے چنانچہ رنگین اور دیگر ہزل سرا شعرا کا اصلی علاج بذریعہ فصد ہونا چاہیئے تھا۔

مرزا کی طبیعت میں خیالات سفلیہ کو مطلق بار نہیں خندہ اصلاح عیوب کے لئے ایک تازیانہ ہے اس میں انصاف نہیں بلکہ ظلم پایا جاتا ہے۔ سودا اور اکبر کے قہقہوں کی یہی شان ہے۔ غالب کی طبیعت میں رحم ہے وہ انسانی کمزوریوں پر لب آسا ہنستے نہیں بلکہ چشم آسا روتے ہیں۔

خندہ لاتعلقی کی علامت ہے۔ زندگی کو جو شخص دُور سے دیکھتا ہے اور خود بے پرواہ رہتا ہے وہ ہنستا ہے اور جو قریب سے دیکھتا ہے اور اس میں شریک ہوتا ہے وہ نہیں ہنستا۔ غالب زندگی کی خارجی کیفیات سے اندرونی جذبات کا اندازہ نہیں کرتے بلکہ اپنے اندرونی جذبات سے خارجی کیفیات کا موازنہ کرتے ہیں اس لئے غالب کے لب ہنسی سے ناآشنا ہیں

خندہ غم سے ناواقف ہونے کی اور لطف خواب کی علامت ہے اطفال شیر خوار سوتے میں ہنستے ہیں لیکن جب بیدار ہوتے ہیں تو روتے ہیں۔ جب تک انسان آلام اور مصائب سے شناسا نہیں ہوتا ہنستا رہتا ہے لیکن جب دل ٹوٹ جاتا ہے تو بجز غم کے کوئی رفیق نہیں رہتا۔ بدنصیب مرزا سے قہقہہ نشاط کی اُمید رکھنا بے جا توقع ہے۔

خندہ غم اور سکون کو چھپانے کا پردہ بھی ہے۔ اس مسئلہ پر برگسان (Bergson) اور غالب متفق ہیں۔ برگسان اپنی کتاب "خندہ" (Le Rire) کے اختتام پر لکھتا ہے

> سمندر میں سطح پر موجوں میں رقص اور ارتعاش پایا جاتا ہے لیکن عمق قلزم میں ہمیشہ امن و سکون ہوتا ہے بالائے آب لہریں آپس میں ٹکراتی ہیں اور کف لے آتی ہیں۔ بچے کف دریا کو "نمش" جان کر ساحل سے اُٹھا لیتے ہیں لیکن جب ہاتھ کھول کر دیکھتے ہیں تو بجز پانی کے کچھ بھی نہیں پاتے۔
>
> قہقہہ زندگی کے سمندر کا کف ہے جو شخص اس کے رقص کو فاصلہ سے دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے اور آفتاب سے

اُس کا سامدار جسم روشن ہو کر طلسم نور نظر آتا ہی لیکن جو قریب جاتا ہے محض فریب پاتا ہے اور تلخ کام ہوتا ہی۔"

مرزا یوں فرماتے ہیں۔

عرض نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہی ۔۔۔ دعویِ جمعیت احباب جائے خندہ ہی

ہی عدم میں غنچہ محوِ عبرت انجامِ گل ۔۔۔ یکجہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہی

کلفت افسردگی کو عیش بے تابی حرام ۔۔۔ ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہی

شورشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں ۔۔۔ دل محیط گریہ و لب آشنائے خندہ ہی

لیکن مرزا کو کبھی بلند آواز سے نہیں ہنستے گاہ گاہ زیر لب تبسم ضرور کرتے ہیں۔ ان کا تبسم تمسخر نہیں بلکہ مزاح (Espirit) کا انداز رکھتا ہی یہ ابتسام معشوق کے کسی خلاف عادت کام سے یا اپنے کسی خلاف عادت ارادہ یا واقعہ سے پیدا ہوتا ہی اس میں کسی کی بابت کسی کے متعلق کوئی حملہ یا اشارہ عیاں یا پنہاں نہیں ہوتا بلکہ بقول وکٹر ہیوگو (Victor Hugo) اس کا منشا (Pour rien, pourle plasir) ہوتا ہی۔

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام ۔۔۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا ۔۔۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی ۔۔۔ سُن کے ستم ظریف نے مجھکو اُٹھا دیا کہ یوں

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی ۔۔۔ بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو ۔۔۔ دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے ۔۔۔ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے ۔۔۔ اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ان ہی وجوہ سے مرزا نے کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی۔ ایک شعر کی نسبت جو شہزادہ جوان بخت کے سہرہ کا مقطع ہے یہ کہا گیا تھا کہ ذوق پر حملہ ہے لیکن مرزا قطعہ گزارش میں کہتے ہیں کہ مقطع میں محض سخن گسترانہ بات آپڑی ہے اور کمال فراخ دلی سے اس قصور کے لئے بھی معافی کے طالب ہیں۔ آزردن دوستان خطاست۔

دو ایک اور اشعار کی نسبت گمان ہو سکتا ہی کہ ذوق پر جن سے چشمک ضرور تھی زد ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں　　یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف　　آج سینے میں مرے درد سوا ہوتا ہے

بنا ہے شہ مصاحب پھرے ہے اتراتا　　وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

یہاں خیال یہ ہے کہ لفظ غالب میں ایہام ہے لیکن یہ موشگافی ہے اور عیب جو کا اپنا آپ قصور ہے۔

(۱۶)

ملک ناروے کا مشہور ادیب (Henrik Ibsen) ہنرک ابسن اپنے ناٹک (Kongs Emnerne) "وارثان تخت" میں بادشاہ اور مغنّی کے درمیان مفصلہ ذیل گفتگو لکھتا ہے:-

بادشاہ۔ تم کس طرح مغنّی ہو گئے۔ تم نے فن موسیقی کس سے حاصل کیا؟

مغنّی۔ جہاں پناہ فن موسیقی تحصیل نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ۔ نہیں۔

مغنّی۔ نہیں۔ میں نے یہ خداداد اکرام غم کے ہاتھوں پایا ہے۔

بادشاہ۔ تو کیا مغنّی ہونے کے لئے غم کی ضرورت ہے۔

مغنّی۔ مجھکو غم سے یہ دولت ملی، بعض کو مسرت سے یہ نعمت حاصل ہوتی ہے اور.........

بادشاہ۔ اور.........

مغنّی۔ تیقن سے جو ایمان کے درجہ تک ہو اور شک سے.........

بادشاہ۔ شک سے بھی۔

مغنّی۔ جو ایمان کے درجہ تک ہو، ناقص نہ ہو۔

بادشاہ۔ ناقص شک کس کو کہتے ہیں۔

مغنّی۔ جہاں پناہ جس میں شک کرنے والے کو خود اپنے شک میں شبہ ہو۔ یہ شفق ہے جو نور اور ظلمت دن اور رات دونوں سے محروم رکھتی ہے۔

مرزا غالب اپنے شکوک میں کامل ہیں چنانچہ دریافت کرتے ہیں۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ... گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع ... گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ... حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود!! ... پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے!!
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں!! ... غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے!!
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے!! ... نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے!!
سبزۂ و گل کہاں سے آئے ہیں!! ... ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے!!
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ ... آخر کیا ہے تو اے "نہیں ہے"
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے ... لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

(۱۷)

جب عمر خیام کی شیرازی شراب کو فزجیرلڈ (Fitzgerald) نے ابریق مغرب میں محفلِ فرنگ میں پیش کیا تو سب نے یہ سوال کیا کہ یہ مینائے معرفت ہے یا بادۂ مجاز۔ مغربی عمر خیام کے کلام میں ابیقورس کے فلسفۂ ابتہاج کی شوخی اور بیباکی پاتے ہیں اور خیام کی تلقین لذات و شہوات سے متمتع ہونے اور دنیاوی لذائذ کے ذریعہ سے نفس کو تسکین دینے میں خیال کرتے ہیں۔

اگر غالبؔ کا انگریزی المانی فرانسیسی یا روسی زبان میں ترجمہ ممکن ہو اور کیا جائے تو عجب نہیں کہ یہی سوال غالب کے متعلق پیدا ہو۔ لیکن مرزا کی شراب کے طہور کے ثابت کرنے کے لئے کسی علم البیان کے رسالہ کی مدد ضروری نہیں بلکہ خود اُن کا بیان موجود ہے۔

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ... چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ... بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مرزا کی شراب بے خودی مراد ہے۔ یہ وہ کیفیتِ جذب ہے کہ جہاں سالکِ راہِ طریقت پر فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے باادب اور خاموش جا رہے ہیں یہ سرِ راہ بیٹھے اللہ ہو کے نعرے لگا رہے ہیں۔

(چوں عمر تبہ کردم چنداں کہ نگہ کردم | در کنج خراباتے اُفتادہ خراب اولیٰ)
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم | درد یک ساغر غفلت ہی چہ دُنیا و چہ دیں
ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم | لغو ہی آئینۂ فرق جنون و تمکیں
زمزم ہی پہ چھوڑ دو مجھے کیا طوفِ حرم سے | آلودہ مے جامۂ احرام بہت ہے

یہ سرمستی اور مدہوشی کم مائگی نہیں ہی بلکہ خمخانۂ جاوید میں داخل ہو کر شراب بے اندازہ پی گئے ہیں۔ یہ کیف سرمدی ہے۔ یہ عشق الٰہی کے نشہ میں غش ہیں۔ کون ایسا ہی جو اس کیف میں سرشار ہو کر ہوشمند رہ سکتا ہی۔

حریف جوشش دریا نہیں خودداری ساحل | جہاں ساقی ہو تو باطل ہی دعویٰ ہوشیاری کا

ان ہی کا ظرف ہی کہ اس دانش رُبا شراب کو جس کی دوسرے بو بھی نہیں لے سکتے پیتے ہیں یہ وہ شراب ہے کہ جب ساقی جام میں ڈالتا ہی تو مسیح اور خضر رشک سے سبقت کے لئے کشاکش کرتے ہیں۔

بہشت کی آرزو بھی یہی ہی کہ ایک ہاتھ میں زلف یار ہو اور ایک میں شراب ہو۔

وہ چیز جس کے لئے ہو ہمیں بہشت عزیز | سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

وہ کیسے خوش قسمت ہیں جن کو یہ دولت قسمت ہی۔

جانفزا ہی بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا | سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

آہ تا دمِ آخر کیا آرزوئے بے خودی ہی۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے | رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مادہ خود بے صورت ہی مادہ میں نہ کوئی خوش صورتی ہے اور نہ بدہیتی ہی۔ حسن خارج نہیں باطن ہے۔ حُسن مادہ کے جسم میں نہیں بلکہ صاحب نظر کی نگاہ میں ہی۔ حسن ہیں کا قلب شعلہ ہی مادہ صرف پردۂ فانوس ہی۔ شاعر جو حسن کو دیکھکر محو تماشا ہو جاتا ہی اور اپنی ذات کو خوبصورتی میں فنا کر دیتا ہی۔ یہ کیا ہے ؟ عدم اور ازل میں جو صورت دیکھی ہی وہ شرار کے تبسم کی مثال نظر آتی ہی اور مُنہ چھپا لیتی ہے نہال ثمر ور میں یا عشق پیچاں میں پھولوں میں، یا عطر میں، عورت میں خواہ دوشیزہ ہو یا ناشیزہ کوئی حسن نہیں، حسن اُس اشارہ میں ہی جو جمال الٰہی اُن کے ذریعہ سے کرتا ہی۔

مرزا غالب کو ہر طرف جو جلوۂ روئے صنم نظر آتا ہی وہ "رخِ لیلیٰ" نہیں بلکہ "عارض جان عالم" ہے۔ یہاں تک کہ جب

ہر آنکھ اُس کی دید کی تمنا رکھتی ہے۔

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے ۔۔۔ جوہرِ آئینہ بھی چاہی ہے مژگاں ہونا

لیکن وہ معشوق حقیقی اپنے وصل سے کسی کو خوش کام نہیں کرتا بلکہ شرم اور استغنا اور غرور اُس کو رونمائی تک میں مانع آتے ہیں اور وہ اپنے چہرۂ نازنین سے نقاب نہیں اُٹھاتا۔

شرم اک ادائے ناز ہی اپنے ہی سے سہی ۔۔۔ ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز ۔۔۔ آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

.... وہ اپنی آپ مثال ہے کوئی اُس کی مثال نہیں :۔

سب کو مقبول ہی دعویٰ تری یکتائی کا ۔۔۔ روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے ۔۔۔ پرافشاں جوہرِ آئینہ مثلِ ذرہ روزن میں

جس آئینہ جہاں نما میں وہ پرتو افگن ہو جاتا ہی طوطی جوہر کی حالت مرغ قبلہ نما کی سی ہو جاتی ہے۔

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز ۔۔۔ جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

جو مجذوب عشاق سب دے کر اس کو لے لیتے ہیں وہ بھی اس کا روئے انور سراپا نگہ ہو کر بھی نہیں دیکھ سکتے جب کوئی اور مانع نہیں رہتا تو نگہ خود مانع آتی ہے اور پردہ بن کر حائل ہو جاتی ہی۔

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں ۔۔۔ کرے ہی[1] ہر بن مو کام چشم بینا کا
وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن ۔۔۔ غیر از نگاہ[2] کوئی بھی حائل نہیں رہا

اس یوسف کے عشق میں ایک عالم زنِ عزیز کی مثال دیوانہ ہے لیکن اُس کا صد چاک پیرہن اس کی پارسائی کے منہ پر مہر ہی۔

نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا ۔۔۔ بمہرِ صد نظر ثابت ہی دعویٰ پارسائی کا

مرزا غالب اُن شعرا میں سے ہیں جو حسن کو نیرنگِ قدرت یا کیف مینا یا سرود بربط میں تلاش نہیں کرتے بلکہ عورت کے سینہ میں ڈھونڈتے ہیں۔

---

[1] یعنی گو کرے ہی ۔ [2] یعنی نگاہ اب بھی حائل ہی۔

مرزا غالب کی معشوقہ مریم تھیں جو خیال غیر سے پاک اور جنس مقابل سے بالا ہی بلکہ زلیخا ہی۔ وہ خود یوسف نہیں بلکہ سری کرشن ہیں۔ اُن کے معشوق کی تصویر رافائل (Raphael) نہیں کھینچ سکتا یہ روبنس (Rubens) کا کام ہی:

مانگے ہی پھر کسی کو لب بام پر ہوس　　زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ　　چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو　　سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اُن کا معشوق تمام عشوہ گری کے انداز اور ناز سے واقف ہی:-

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے　　اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہی یہ ادا کہ یوں
سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری　　حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

اس کا حُسن انتہائے جمال ہی ورنہ مرزا جیسے بلند نظر کی نگاہ میں سما بھی نہ سکتا۔ یہ وہ حسن ہے جو نہ صرف مرعوب بلکہ مغلوب کر لیتا ہی۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم　　میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی　　خوں ہی مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

یہاں تک کہ اگر وہ خود اپنے حُسن کو چشمۂ آئینہ میں دیکھے تو یونانی نوجوان نرگس کی طرح تاب نہ لا سکے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے　　صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

عشق کیا ہی؟ آرزوئے وصل جو دو پریشان خاک کے ذرّوں اور دو پریشان دلوں میں یکساں موجود ہے، کن اسباب سے پیدا ہوتی ہی۔ مادہ کی کشش اور دل کی کشش دونوں ایک ہیں کشش کا تقاضا ہی کہ ایک دوسرے کو کشش کرنے والے اجسام جوں جوں قریب ہوتے ہیں کشش میں افزونی ہوتی ہے یہی محبت کی کشش کا حال ہی عشق میں کہیں ایک جانب فاتحانہ غلبہ اور دوسری جانب مفتوحانہ تسلیم۔ کہیں دونوں سمت جوشِ جذبات اور آرزوئے قرب کہیں ایک طرف جویائی اور دوسری طرف گریز پایا جاتا ہی لیکن یہ کشش قلبی کب اور کہاں اور کیوں پیدا ہوتی ہے اُس کا نشان پانا مشکل ہی۔

عشق پر زور نہیں ہی یہ وہ آتش غالبؔ　　کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

فلسفی ذہنی اور دماغی نقطۂ نظر سے عشق کو مرض قرار دیتے ہیں :-

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا　　بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

لیکن دل سے دماغ مجبور ہی :-

عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا　　میں اور اِک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہی

یہ وحشت طبیعت میں ازل سے راسخ ہی اور یہ سکون اور راحت کے مانع آتی ہی -

ورنہ یاں بے رونقی سود چراغ کشتہ ہی　　دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہی ہمیں

یہ وہ مرض ہی طبیعت جس کے علاج سے منحرف رہتی ہے اور ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ کبھی صحت نہ ہو فیضی کا شعر ہی :-

سودۂ الماس در زہر ہلاہل میکنند　　نوشدارو ئی محبت را مپرس اجزا کہ چیست

مرزا غالب اسی شعر کو جلا دے کر فرماتے ہیں :-

کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہی　　نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا

اس عشق جوئی کا سبب یہ ہی کہ اسی ہنگامہ ہائے و ہو سے عالم میں رونق اور جان ہی -

انجمن بے شمع ہی گر برق خرمن میں نہیں　　رونق ہستی ہی عشق خانہ ویران ساز سے

جہاں درد موجود ہو عشق ضرور ثمر لاتا ہی -

جاں سپاری شجر بید نہیں　　عشق تاثیر سے نومید نہیں

تو دیکھ کہ کیا رنگ ہی تیرا مرے آگے　　مت پوچھ کہ کیا حال ہی میرا ترے آگے

اور عشق کا ثمر خانہ ویرانی - بربادی - تباہی - پشیمانی - بے اعتباری - عریانی اور صحرا نوردی ہے -

قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا　　شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا　　بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل

دل بدل پیوستہ گویا اِک کفِ افسوس تھا　　حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو

شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں　　کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں

ایک دل تس پر یہ نااُمیدواری ہائے ہائے　　گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال !!

لیکن گو مرزا غالب کی معشوقہ ایک ارضی عورت ہی ان کا عشق ہوس سفلیہ اور لذات حرصیہ سے پاک ہی اُن کو اس کے حسن بے پایاں کے دیکھنے سے ایک ارتعاش روحانی ایک وجد آلہی پیدا ہوتا ہے جس میں جذبات کامرانی اور خواہشات کامجوئی کا کوئی عنصر نہیں اُس کا جلوۂ رُخ ایک کیفیت وجدانہ پیدا کر دیتا ہی اور جسم کے تار تار میں ایک رقص عشقیہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ حاجت آرزوئے بشریہ سے لاتعلق ہوتی ہی خلوت سفلیہ کیا ہی۔ جب روح گیرائی اور قبضہ کی جانب مائل ہوتی ہی تو یہ ہوس پیدا ہوتی ہے۔ ہوس مطلوب کو اپنے پرشہوت ہاتھوں سے ملوث کرنا چاہتی ہے۔

عشق کیا ہی عشق میں ادب اور شرم شامل ہیں عشق دوسرے پرستش اور پرستاری کرتا ہی جہاں اضطراب آتش زیر پا ی خوف ہی وہاں عشق نہیں عشق نور ہے اور جلوت اور خلوت دونوں کو اپنی ضیا سے روشن کرتا ہی۔

میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی — اے وہ جلوت نہیں خلوت ہی سہی

میدان عشق میں جہاں جانا بازیِ طفلاں نہیں ہی ہزاروں میں سے ایک عزت سلامت لاتا ہی اس ہی عشق کا درجہ ہی کہ

چپک رہا بدن پر لہو سے پیراہن — ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہی

جلا ہی جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا — کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہی

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل — جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہی

جو اہل ہوا و ہوس اس کوچہ عشاق میں قدم رکھتے ہیں وہ اہل دل کو بدنام کرتے ہیں:۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اس عشق حقیقی میں ایک کیف دائمی ایک خمار ابدی ہے ہمیشہ آرزوئے وصل رہتی ہے کبھی پوری نہیں ہوتی اس کا لطف جو جانکنی سے زیادہ لطف بخش ہی کبھی کم نہیں ہوتا۔ "وصال یار" وہیں ہی جہاں عشق آرزو خام ہے اور اسیر آز ہی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

یہاں تک کہ عاشق سراپا ایک "شعلہ مضمر" بن جاتا ہی۔

گر نگاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط — شعلہ خس میں جیسے خون رگ میں نہاں ہو جائیگا

جہاں اس کا حُسن حقیقی بے پایاں ہی وہیں مرزا کی تاب عاشقی بے نہایت ہی۔

کیوں جل گیا نہ تاب رُخِ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

گرتی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

یہ انتظار غیب اور حضر دونوں میں یکساں رہتا ہے خود نظارہ رُخِ یار کا پردہ بن جاتا ہے۔

میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں　　مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہی　　میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھسے دیکھا جائے ہی

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا　　مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

یہاں تک کہ اگر وہ معشوق صہبائے محبت میں مدہوش قبائے حریر کے بند خود کھول دیتا ہی تو بھی۔ع

زشادی دست و پا گم می شود خود را نمی یابم

دی نے کیا ہی حسن خود آرا کو بے حجاب　　اے شوق یاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے

اس مدام لب دریا تشنہ لبی کا باعث صرف یہ ہی کہ علوی محبت کبھی جسمانی قرب سے خود کو سیراب نہیں کرتی اگر معشوق کے دست نازنین کو مکرر بوسہ دیا جائے تو دوسرے بوسہ میں یا تو پہلے کے مساوی لذت ہوگی یا اس وجہ سے کہ پہلا بوسہ لینے سے معشوق کی نارسائی کی شان جاتی رہی ہے اور اگر مساوی ہی تو بھی چوں کہ پہلے بوسہ سے بوسہ کی کیفیت کی لاعلمی جاتی رہی ہے ضرور کم ہوگی۔ فارسی قصہ نگار نے اگروگل کے داستان میں اور فرانسیسی داستان گو نے Mademoiselle de Maupin اسی امر کو بیان کیا ہی۔

گر تزدجی میں ہو خیالِ وصل میں شوق کا زوال　　موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

اس عشق کے اہل اہل ولا کی طرح ہر زمانہ میں شاذ ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

کون ہوتا ہی حریفِ مے مرد افگنِ عشق　　ہی مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی　　کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہی بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ　　کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

کیا شاعری مصوری ہی؟ اس میں شک نہیں کہ فن مصوری اور فن شاعری ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں دونوں کا کام غیر موجود اشیا کو حاضر اور واقع دکھلانا ہی دونوں کی بنا ایک خوش انداز فریب پر قایم ہے مصوری سرمہ آواز شاعری ہی اور شاعری شیریں زبان مصوری ہے۔ جہاں مصور کا موقلم رنگ اور خطوط سے مختلف حقیقی یا مجازی مضامین

صورت دیتا ہی وہیں شاعر کا قلم الفاظ اور انداز بیان سے وہی کیفیت پیدا کرتا ہی الفاظ شاعر کے رنگ ہیں اور الوان مصور کے الفاظ ہیں۔

ارسطو کا بیان ہی کہ شاعری کا مقصد قدرتی اشیا کی نقل ہی لیکن اس کا منشا یہ نہیں کہ شاعر کا کام واقعات کو اُن کی من وعن بے رنگ کیفیت میں نقل کرنا ہی بلکہ یہ ہے کہ شاعر کو محاکات اُس حالت میں دکھلانا چاہیئے جس میں چشم تخیّل اُن کو دیکھتی ہی۔ یورپ کے بہت سے موجودہ شعرا واقعات زندگی کی ہُو بہُو تصویریں اُتارتے ہیں لیکن یہ عکاسی ہے مصوری نہیں اور کم رتبہ کام ہی۔

شکسپیر کے کلیات میں جو جذبات انسانی کے مرقعات ہیں وہ گویا بالکل زندگی سے مماثل معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں تخیل سے رنگین ہیں اور یہی رنگ ہی جو شکسپیر کے کلام کو لاثانی بناتا ہی مرزا کی مصوری شکسپیر کی مصوری ہی۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہی — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

ہوریس کی رائے میں تصویریں خواہ وہ مصور کی بنائی ہوئی ہو یا شاعر کی کوئی بات موزونیت کے خلاف نہ ہونی چاہیئے (۱۱-۱۳) حسُن موزوں ہونا چاہیئے (۱۴-۲۳) خمیدہ ناک آنکھوں اور بالوں کی خوبصورتی کو بھی ضائع کردیتی ہی (۳۵-۳۷)

مرزا کی محاکات میں یہ خوبی غایت قطعی ہی۔

شمار سبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل نظر آیا — تماشائے بیک کف بُردن صد دل پسند آیا

سب رقیبوں سی ہوں ناخوش پر زنان مصر سے — ہی زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لیئے — آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کری خدا کہ یوں

یہ مرزا ہی کی قدرت بیان سُرعت انتقال اور شدت ذکا کا کمال ہی کہ ان تصاویر کو ایسے متناسب اور متوازن الفاظ میں کھینچا ہی۔ ان اشعار کے الفاظ کی لطافت اور اثریت ہلکے سے ہلکے رنگوں کی سیالیت کو مات کرتی ہی۔ لیسنگ نے ایک عالمانہ بحث میں بیان کیا ہی کہ :-

"اصنام اور اشعار میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ بُت سکون اور اشعار جنبش کا اظہار کرتے ہیں جب حسُن سمٹ کر چپ چاپ

کھڑا ہو جاتا ہے تو مجسمہ کہلاتا ہے اور جب حرکت اور رقص کرنے لگتا ہے تو شعر نام پاتا ہے۔ اجسام صنم سازی کا اور افعال شاعری کا موضوع ہیں۔ شعر میں تصویر سینہ موطو غراف کی طرح رواں حالت میں ہوتی ہے اور مسلسل کیفیت دکھلاتی ہے۔"

قاآنی موسم بہار کی تصویر یوں کھینچتا ہے:۔

"نرمک نرمک نسیم زیر گلان می خزد غب غب این می لمد عارض آن می گزد گہ بچمن می چمد گہ بہ چمن می دزد۔ گاہ بشاخِ درخت گہ بہ لبِ جوئبار۔

ہوا کی یہ رفتار شاعر قرطاس پر قلم ہی سے دکھلا سکتا ہے مصور پردہ پر مو قلم سے نہیں دکھلا سکتا۔ مرزا کے قلم کی یہ تصویر ملاحظہ ہو۔

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے	جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو	عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم	برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس	مدّت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحت دل کو چلا ہے عشق	سامان صد ہزار نمک داں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل	ساز چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب	نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے	پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب	عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کئے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال	صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا	جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس	زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو	سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ ـــ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں ـــ سر زیر بارِ منّتِ درباں کئے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہی پھر وہی فرصت کے رات دن ـــ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے ـــ بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

ہجر میں ارمان وصل کا مرقع اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہی عاشق کی تمام زندگی ان اشعار میں موجود ہی۔ اوّل اُس زمانہ کو بیان کرتا ہی جب محفلِ وصل شراب سے لبریز آبگینوں سے روشن رہتی تھی۔ پھر کہتا ہی کہ تقاضائے احتیاط جو کچھ بھی ہو فراقِ یار میں تسکین ناممکن ہی اس کے بعد دل کے نہ ماننے اور پھر طوافِ کوئے ملامت کو جانے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہی نالۂ دلدار کے تصور سے ہاتھوں کا کانپنا کہ خوشی سے اُس کو کھول بھی نہیں سکتے اور پھر کسی کے در پر پڑے رہنے کا قصد مصمّم کرنا عشقیہ جذبات کا ایک مرقع ہی ہر شعر ان میں سے ایک مکمّل تصویر ہی اور ہر تصویر اپنے سے مابعد تصویر سے متعلق ہی کوئی مصور رنگ سے وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا جو شاعر نے یہاں کیا ہی۔

بوعلی سینا نے شفا میں محاکات سے لذّت پانے کی دلیل یہ لکھی ہے کہ ہر شے کی تصویر خود لطف انگیز ہی خواہ وہ شے فی نفسہ بُری ہو یا بھلی چنانچہ جو حیوانات نامقبول صورت ہیں اُن کی تصویریں دیکھکر بھی لوگ خوش ہوتے ہیں لیکن باوجود اس امر کے بلند پایہ مصور بدصورت اشیا کی تصویر اُتارنے سے کنارہ کرتے ہیں حُسن سیرت کو حُسن صورت سے جو تعلق ہی اُس کا تقاضا ہے کہ باطنی خیالات اور تصورات کا اثر چہرہ اور بشرہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظلم یا غصّہ کی حالت میں دلفریب سے دلفریب صورت کے خدوخال نامقبول ہو جاتے ہیں اور جذبہ کی شدّت حُسن کو باطل کر دیتی ہی اس لئے اُستاد ایسی حالت کی تصویر کھینچنے سے ابا کرتے ہیں۔

یونان کے مشہور قدیم مصور سے جب رحم میڈیا کی تصویر کھینچنے کے لئے کہا گیا تو اُس نے اُس کی تصویر اُس وقت کی حالت میں کھینچی جب کہ وہ تذبذب کی حالت میں تھی اور ہنوز قتل پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔ غالبؔ نے بھی معشوق کے رقیب کی آغوش میں ناز کرنے کی کیفیت کو حوالہ تصویر نہیں کیا کہ جو ناشیزگی اس انداز میں پائی جاتی ہی وہ کسی مرقع میں ادا کئے جانے کے قابل نہیں۔ یہ ایک ایسا نظارہ ہی جس کو کوئی آنکھ دیکھنا پسند نہیں کرتی اسی لئے اس جان آزار منظر کی کیفیت کو یوں دکھایا ہی۔

نقش نازِ بُتِ طنّاز بآغوشِ رقیب   پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

گویا فلپس شاعر کا قول میڈیا اور شاعر کی بے وفا معشوقہ کے بارہ میں یکساں درست ہے:۔

"اے ظالمہ تو اسی قابل ہے کہ پردۂ تصویر پر بھی تیری صورت نہ دکھائی جائے۔"

شعر کا تعلق وقت سے اور تصویر کا تعلق فضا سے ہے تصویر ایک نگاہ میں اپنے مضمون کو ظاہر کر دیتی ہے شعر وقت کا طالب ہوتا ہے اور کلی کی طرح رفتہ رفتہ اپنے معنی کو بیان کرتا ہے تصویر ایک ثانیہ کی یادگار ہے شعر ایک تتلی ہے جس کے پیچھے خیال بچہ کی طرح کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے مثلاً جب یہ شعر پڑھا جاتا ہے

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں   بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

تو تصور گوش آشنا ہوتے ہی اوّل دُرِ دنداں اور لب مرجاں کا نقشہ کھینچتا ہے پھر مسّی کی اُداہٹ اور پان کی سُرخی کے ساتھ اُن میں تبسّم کا رنگ بھرتا ہے پھر رُخ نگاری میں مشغول ہوتا ہے اور سرمہ کی تحریر اور قشقہ کی لکیر تک بھی نہیں بھولتا اور پھر گردن کے اُتار اور سینہ کے اُبھار کے خطوط کی کشش سے پیکر طیار کرتا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دستِ حنائی میں جو چیز ہے وہ بھی اور جس غرفہ میں وہ پردہ آویزاں ہے اُس کو بھی دکھاتا ہے۔

شبلی کا بیان ہے کہ ایک بڑا فرق عام مصوّری اور شاعرانہ مصوّری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اُس کا ایک ایک خط و خال دکھایا جائے لیکن شاعر اکثر محض اُن چیزوں کو لیتا ہے اور اُن کو نمایاں کرتا ہے جس سے صرف ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا اُن کو دُھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں اُن سے خلل نہ آئے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم   میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے   اُس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

سادگی و پُرکاری بیخودی و ہشیاری   حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی   خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

ہومر جب کبھی معشوق کی شاعرانہ تصویر کھینچتا ہے تو چوں کہ وہ اُستادوں کا اُستاد ہے کبھی اس سے زیادہ نہیں کہتا کہ ہیلن میں دیویوں کا سا حسن تھا حالانکہ تمام رزم نامۂ الیڈ کی بنیاد ہیلن کے حُسن پر قایم ہے۔ ارسطو جو اُستادوں کے

درجہ کو نہیں پاتا جب اپنی کتاب آرلینڈ و فروزیو میں الکینیا کی شاعرانہ تصویر کھینچتا ہے تو اُس کا پُورا سراپا لکھ جاتا ہی
صرف دو جگہ اتنا لکھا کہ ہیلن کی باہیں گوری تھیں اور اُس کے بال خوشنما تھے۔ غالب نے بھی کل دیوان میں زلف و
چشم سیاہ سے زیادہ اپنے معشوق کا پتہ جس طرح بعض اوقات مجسمہ سازیت میں باوجود جسم جامد کے حرکت کا دھوکا
کردیتا ہی اُسی طرح بعض اشعار میں محاکات بھی موقلم کی رنگین تصویر کی طرح خاموش ہوتی ہے کانٹ دوکیلس کی رائے
کہ بہترین شعر وہ ہی جس کے مضمون کو مصوّر بلا دقت صفحۂ قرطاس سے جامہ تصویر پر منتقل کر سکے اور جو حالت خواب
میں قایم ہو وہ بیداری سے مُبدّل نہ ہو اگر اس خیال سے اتفاق نہ کیا جائے تو ان اشعار سے بہتر مثال ممکن نہ

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر — روکش سطح چرخ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

یہ کل اشعار ایک نظارۂ قدرت پیش کرتے ہیں جس میں متصل او مسلسل واقعات نہیں بلکہ صرف ایک دلفریب
منظر ہی عقب میں نیلگوں اُفق ہی آفتاب چمک رہا ہی اور قرص ماہتاب بھی بیتاب او ر ماند موجود ہی۔
بارش نے زمین کو آئینہ یاب بنا دیا ہی سامنے ایک تالاب ہی سبزہ کی یہ زیادتی ہے کہ سطح آب تک دست
ہی اشجار گُل پوش اور گلبار ہیں سب سے آگے شاخ نرگس گویا چشم نرگس مشغول تماشا ہی ایک چڑیا یا تتلی تک بھی تو نہیں
اس خاموشی میں شور یا حرکت پیدا کرے غالب نے حقیقت میں ورجل کو بھی جس کی نظم کنار دریا کے متعلق مشہور ہے ما
کر دیا ہی۔

علمی مصطلحات دیسی زبانوں میں

(از جناب نواب عماد الملک بہادر (مولوی سید حسین صاحب بلگرامی) سی ایس آئی ظلہٗ)

یہ مضمون جناب نواب عماد الملک بہادر نے پچاس سال قبل انگریزی زبان میں تحریر فرمایا تھا۔ کاش یہ بحث اس کے بعد بھی جاری رہتی۔ باوجود اس قدر مدت گزرنے کے اُس میں وہی جدّت اور خیالات کی تازگی موجود ہے اور ہمارے مقصد کے لئے اب بھی ویسا ہی مفید اور قابل قدر ہے۔ وضع اصطلاحات کی بحث میں یہ پہلا مضمون ہے جو ایسی عالمانہ اور مجتہدانہ شان سے لکھا گیا ہے کہ جو حضرات اس بحث سے ذوق رکھتے ہیں اسے بغور مطالعہ فرمائیں گے۔ ہماری درخواست پر فاضل ممدوح نے اُن اصول کا ایک خلاصہ بھی تحریر فرما دیا ہے جن کے مطابق اُردو میں اصطلاحات وضع ہونی چاہئیں۔ یہ تحریر اس مضمون کے آخر میں درج ہے۔ اڈیٹر

تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا حکومت بنگال نے دیسی زبانوں میں طبی رسائل کی تالیف کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اب اس کمیٹی کے دو ارکان کی آرا شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن سوال محض طب ہی کی اصطلاحات کا نہیں۔ بلکہ اس مسئلہ کا تعلق ان تمام علوم کی مصطلحات سے ہے جو جدید فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ ہمارا مقصد ایک ایسا قاعدہ وضع کرنا ہے جس کے مطابق سائنس کی تمام اصطلاحات کو دیسی زبانوں کا جامہ پہنایا جا سکے۔ کتب سائنس اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ہر قسم کی مغربی تصنیفات کے مترجم کے لئے سب سے بڑی مشکل ان اصطلاحات کی کثیر تعداد ہے جن کے مترادف دیسی زبانوں میں بالکل نہیں ملتے۔ اسی مشکل کی وجہ سے اُردو میں بہت کم کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ہے اور اچھے تراجم کی تعداد تو اسی وجہ سے اور بھی قلیل ہے۔

اس مشکل کو رفع کرنے اور دیسی زبانوں کو نو آموز مترجمین کے مضر اثر سے بچانے کے لئے جو ان زبانوں میں مترادف الفاظ کے ہوتے ہوئے بوجہ لاعلمی یا تو نئی اصطلاحیں گھڑ لیتے ہیں یا موجودہ الفاظ کے غلط استعمال سے ایک ایسا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں جو آیندہ نسلوں کو رد کر دینا پڑے گا۔ مستند الرائے حضرات کے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ کوئی ایسا قاعدہ کلیہ مقرر کریں جس سے اس قسم کی لچکیلی اصطلاحات بنائی جائیں جو ہماری نئی علمی ضروریات کو پورا کر سکیں

اور ہماری دیسی زبانوں کی فطرت سے ایسی مطابقت رکھتی ہوں کہ بلا تکلف ان میں ضم کی جا سکیں۔

لیکن اس مسئلہ میں اختلاف آرا اس قدر ہی کہ کوئی خاص قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا جس پر تمام علما، جو رائے قایم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں متفق ہوں یا اظہار تشفی کریں۔ اس وقت ہمارے سامنے تین مختلف تجاویز ہیں جن میں مختلف خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ اور ہر تجویز میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک فاضلِ اجل و ماہرِ علم اللسان بابو راجندر لال مترا کا مقبول و عالمانہ تبصرہ ہی۔ علمی اصطلاحات پر اس سے زیادہ مبسوط بحث پہلے کبھی ہماری نظر سے نہیں گزری دوسرا تبصرہ اس ملک کے نامور طبیب مولوی تیز خاں بہادر کے قلم سے ہی جنھیں اس صوبہ کی دونوں زبانوں میں علوم تشریح الابدان وطب کی تعلیم دینے کا بہت عرصہ سے تجربہ ہی اور سالہا سال سے اپنے ابنائے وطن میں مغربی تعلیم پھیلانے کی نہایت شوق سے مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ لہذا ان کا قول مسئلہ زیر بحث کے لئے ایک بہت بڑی سند کا حکم رکھتا ہی۔ تیسری رائے مہتمم مدارس حلقۂ بہار کی ہی جس کا کلکتہ کی کمیٹی سے کچھ تعلق نہیں۔ لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہی کہ اس کے ساتھ بہت سی عملی مثالیں سائنس کی کتابوں کے متعدد ترجموں کی شکل میں بطور نمونہ دی گئی ہیں جن پر ہم بعد میں حسب ضرورت نظر ڈالیں گے۔

ہم فی الحال ان تمام تجاویز کی نمایاں خصوصیات نہایت اختصار کے ساتھ دکھانے پر ہی اکتفا کریں گے۔ ایک دلفریب اپنی رائے کو کسی آیندہ صفحے کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔

• بابو راجندر لال مترا اصطلاحات کا ترجمہ کرنے کے زبردست حامی ہیں۔ لیکن وہ ترجمہ لفظی پابندیوں میں جب تک دبا نہ ہو۔ جس طرح چینی نقل کرتے وقت کھی پر کھی مارتے ہیں۔ بلکہ اس ترجمہ سے ایسے الفاظ پیدا ہونے چاہئیں جو اشیاء بھی تو نیز متذکرہ کے لئے علامات کا کام دیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ الفاظ اشیاء کا ایک دھندلا تصور ظاہر کریں جو قدیم رہے ما زمانے میں کسی نسل نے غلطی سے ان کے متعلق اپنے ذہن میں قایم کیا تھا جس وجہ سے غلط الفاظ اس کی زبان میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو گئے اور زمانۂ قدیم سے مستعمل ہونے کے باعث اب تک مروج ہیں۔

صاحب موصوف نے اپنے مقصد کے لحاظ سے جملہ الفاظ کو چھ قسموں میں تقسیم کیا ہی اور ہم نہیں چاہتے کہ ان کی تقسیم کی انتہائی موزونیت اور کمال کا اختصار سے خون کیا جائے۔ لہذا ہم انھیں کے الفاظ درج کئے دیتے ہیں:-

مختلف علوم کی ان تمام اصطلاحات کا جو طبی مدارس میں بالعموم پڑھائے جاتے ہیں بغور مطالعہ کرنے کے بعد

میں نے یہ رائے قایم کی ہو کہ وہ چھ اقسام یا اصناف میں تقسیم کی جاسکتی ہیں جن میں سے ہر قسم اپنی امتیازی خصوصیت رکھتی ہو۔

پہلی قسم میں زبان کے وہ معمولی الفاظ شامل ہیں جو کبھی کبھی بطور اصطلاحات استعمال ہوتے ہیں۔

دوسرے قسم کے الفاظ میں جامد اسمار اور مختلف چیزوں کے نوعی نام شامل ہیں جیسے مالٹ (شعیر منقوع) بیسٹ (خمیر) رینٹ (　　) وغیرہ۔ گو یہ الفاظ نہایت عام فہم ہیں لیکن زیادہ تر ایک خاص فن میں استعمال ہونے کی وجہ سے انھوں نے ایک نیم اصطلاحی شکل اختیار کرلی ہو اور یہ سائنس اور روز مرّہ کی زبان کے بین بین ایک بحث طلب حیثیت رکھتے ہیں۔

تیسری قسم کے الفاظ سائنس کی اشیاء کے غیر اشتقاقی نام ہیں مثلاً کونین۔ اپی کگوانہا (ایک تلخ دوا جو ایک امریکائی پودے کی جڑ سے حاصل کی جاتی ہے) ٹیلریم (ایک دھات) سلینیم (ایک دھات) برومین (ایک مفرد مائع) و　ا　ا۔ جب یہ الفاظ وضع کیے گئے تو اکثر حالتوں میں جن چیزوں کے لئے استعمال کیے جاتے تھے ان کی کوئی خاصیت ظاہر کرتے تھے لیکن اُن میں سے بہت سے الفاظ کے اشتقاقی معنی عرصہ دراز سے مفقود ہوگئے ہیں اور یہ الفاظ اب دوسرے درجہ کے جامد بن گئے ہیں جنھیں سنسکرت میں "یوگ روڑھی" کہتے ہیں۔

چوتھی قسم میں نباتات وحیوانات کے مرکّب علمی ناموں کا شمار ہو جو ابتدا میں اشتقاقی معنی رکھتے تھے۔ لیکن بوجوہ چند در چند ان میں سے اکثر الفاظ کی اب یہ کیفیت نہیں رہی اور اب وہ کسی خاص نوع یا جنس کا نام ظاہر کرتے ہیں، جونیسیا الیوکا (Jonesia Asoka) کوئیس بھکتی (Coius bhekti) وغیرہ۔ لہذا گزشتہ اقسام کی طرح یہ بھی جامد اسمار تصوّر کیے جاسکتے ہیں۔

پانچویں قسم سے اُن مفرد الفاظ کو تعلق ہو جن کے اشتقاقی معنی نہایت صاف وصریح ہوتے ہیں اور صرف اسی حد تک کارآمد ہیں جب کہ سامع پر اپنے اشتقاقی معنی بخوبی واضح کردیں۔ چوں کہ یہ الفاظ صرف علوم وفنون ہی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے انھیں خالص اصطلاحی سمجھنا چاہیئے۔

چھٹی قسم میں وہ مرکّب اصطلاحات شامل ہیں جن کا کم از کم ایک اور اکثر حالتوں میں ہر جزو کچھ نہ کچھ اشتقاقی معنی ضرور رکھتا ہو۔ یہی معنی اُن اصطلاحوں کی جان ہوتے ہیں اور اس شی کی نوعیت معلوم کرنے کی غرض سے

جس کے لئے کوئی اصطلاح استعمال کی جاتی ہو لازمی ہے کہ سامع ہر جزو کا مطلب بخوبی سمجھ لے۔

الفاظ کی ان چھ قسموں کا فاضل موصوف نے اس طرح تصفیہ کیا ہے۔ (ہم ذیل کی عبارت صاحب موصوف ہی کے تبصرہ کے خلاصہ سے جس میں اُنھوں نے مسئلہ ہذا پر شرح وبسط کے ساتھ بحث کی ہے نقل کرتے ہیں)

(۱) خلاصہ کلام پہلا قاعدہ جو میں تجویز کرتا ہوں یہ ہے کہ ان تمام اصطلاحات کا جو اشیا کی صفات ظاہر کرتی ہیں بغیر استثنا ترجمہ کیا جائے یا ضروری ترمیم سے انھیں مفید مطلب بنایا جائے۔ لیکن اگر ہندوستانی زبانوں میں مترادف الفاظ نہ ملیں تو مفرد اشیا کے نام یورپی زبان سے لئے جاسکتے ہیں اور اس قاعدہ کے استعمال کے متعلق میری یہ رائے ہے۔

(۲) قسم اوّل کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے۔

(۳) قسم دوم کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انھیں موزوں بنالیا جائے اور بشرط ضرورت ان میں اصلاح کی جائے۔

(۴) قسم سوم کے الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے دیسی زبان میں لکھا جائے۔

(۵) قسم چہارم کے الفاظ کا املا خاص قواعد کی پابندی سے بلا تغیر و تبدل دیسی زبان میں لکھا جائے۔

(۶) قسم پنجم کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے یا مناسب ترمیم سے انھیں موزوں بنالیا جائے اور بشرط ضرورت ان میں اصلاح کی جائے۔

(۷) قسم ششم کے الفاظ کا ترجمہ کیا جائے اور بشرط ضرورت ان میں اصلاح کی جائے۔ لیکن آلات کے نام اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کا صرف املا ہی دیسی زبان میں لکھا جائے۔

(۸) مترجمین کی رہنمائی کے لئے چند آسان قواعد مرتب کئے جائیں۔

(۹) اصطلاحات کے مکمل لغات تیار کئے جائیں، جن میں دیسی زبان کے مترادف الفاظ یا اُن الفاظ کا املا دیسی زبان میں درج ہو جن کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

ڈاکٹر تمیز خاں اس بات میں تو بابو راجندر لال سے متفق ہیں کہ دیسی زبان کی اصطلاحات اگر مل سکیں تو ضرور اختیار کی جائیں لیکن وہ نئے الفاظ گھڑنے کے مؤید نہیں ہیں۔ کیوں کہ وہ اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ دیسی زبانوں میں مترادف

نہ ملنے کی حالت میں وہ نئی اصطلاحات وضع کرنے کے لئے عربی و سنسکرت سے کام لینے کے بجائے بہتر یہی سمجھتے ہیں کہ مغربی اصطلاحات کو برقرار رکھا جائے۔

اُن کی رائے حسب ذیل ہے:۔

اس تجربہ کی بنا پر جو طب انگریزی کے بعض شعبوں کا اُردو و بنگالی میں ترجمہ کرنے اور انھیں زبانوں میں اس کی تعلیم دینے سے مجھے حاصل ہے۔ میں وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ترجمہ کے لحاظ سے سائنس کی مغربی اصطلاحات تین جداگانہ اصناف میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

صنف اوّل میں ایسی مشہور و معروف علمی اصطلاحوں کا شمار ہے جن کے صحیح مترادف اُردو و بنگالی دونوں زبانوں میں موجود ہیں۔

صنف دوم میں وہ بے شمار علمی اصطلاحیں شامل ہیں جو طب کی انگریزی کتابوں میں آتی ہیں اور جن کے ہم معنی الفاظ بہ ظاہر دیسی زبانوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس صنف کا ذکر آگے چل کر پھر آئے گا۔

تیسری اور آخری صنف میں وہ اصطلاحی الفاظ شامل ہیں جو طب کی انگریزی کتابوں میں استعمال کئے جاتے ہیں لیکن جن کے مترادف فی الواقعہ دیسی زبانوں میں بالکل موجود نہیں۔ اس صنف میں نسبتاً بہت زیادہ الفاظ شامل ہیں۔

پہلی دو صنفوں کے لئے انھوں نے دیسی زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے کی سفارش کی ہے اور ان الفاظ کے انتخاب کے لئے انھوں نے یہ رائے دی ہے کہ قابل مولویوں اور پنڈتوں کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے لیکن آخری قسم کے الفاظ کے بارے میں وہ کہتے ہیں:۔

ان الفاظ کے متعلق جو میں نے تیسری صنف میں داخل کئے ہیں یعنی وہ اصطلاحات جن کے ہم معنی الفاظ دیسی زبانوں میں مطلق نہیں پائے جاتے اور جن کی تعداد بدقسمتی سے کچھ کم نہیں بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ترجمہ میں مغربی اصطلاحیں ہی اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں بلا تغیر و تبدل قایم رکھی جائیں یا مترجمین دیسی زبانوں میں انھیں ادا کرنے اور ان کا مفہوم بتانے کے لئے نئے الفاظ وضع کریں۔ اس دقیق مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کی تائید میں معقول دلائل و براہین پیش کئے جا سکتے ہیں۔ نئے الفاظ گھڑنے کی مخالفت میں جتنے قوی دلائل بیان کئے جا سکتے ہیں اتنے ہی اس کی حمایت میں بھی پیش ہو سکتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ محض سنسکرت، عربی یا فارسی لفظ

کے جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اس تصور سے کچھ بہتر تصور نہیں ہو سکتا۔ جو اس کا انگریزی، لاطینی یا یونانی نام سننے اور طالب علم کو یہ بتا دینے سے ہوتا ہے کہ فلاں لفظ فلاں شے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا۔ ہمارے کالج کے مختلف شعبوں کی تعلیم میں اور نیز دوسرے کالجوں میں بعینہ کامیابی سے اسی پر عمل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کسی طالب علم سے یہ کہدیں کہ ایک خاص پٹھے کا نام بائی سیپس (Biceps) ہے یا ایک خاص عمل کو اسٹالائیڈ (Hydrolysis) کہتے ہیں یا وہ جسم لمفیٹک گلینڈ (Lymphatic gland) کے نام سے موسوم ہے اور اس کو ان الفاظ کا اشتقاق سمجھنے کی زحمت دیئے بغیر یہ بتا دیں کہ فلاں نام صرف فلاں شی کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا تو ہم دیکھیں گے کہ وہ طالب علم اس کو اچھی طرح شی ذہن نشین کرتا اور یاد رکھتا ہے اور کسی دوسری چیز کے نام سے خلط ملط نہیں کرتا۔

ان الفاظ کی نسبت جو ڈاکٹر ٹائیٹل اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کی محنت سے قبل ازیں وضع ہو چکے ہیں ان کے بہترین استعمال کے متعلق فاضل ڈاکٹر کا یہ خیال ہے:۔

میرا یہ منشا ہرگز نہیں کہ ان کی ناقدری کی جائے۔ یا ان سرگرم نیک نیت اور جلیل القدر مستشرقین کی جانکاہی و عرق ریزی کو بہ نگاہ استحقار و استخفاف دیکھا جائے۔ مگر ان الفاظ کو آیندہ مفید و کار آمد بنانے اور ان لوگوں کو جو محض دیسی زبانوں یا سنسکرت و عربی سے واقف ہیں یورپ کی علمی اصطلاحات کا اشتقاق سمجھانے کے لئے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اولاً ترجمہ کی ہر فصل کا عنوان یورپ کی اصل اصطلاح میں ہو۔ ثانیاً متن کتاب میں صنف اوّل و دوم کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور ثالثاً نئے موضوعہ الفاظ بہ شکل حواشی کتاب میں درج کئے جائیں لیکن کسی حالت میں بھی انھیں کچھ زیادہ اہمیت نہ دی جائے۔

ہمیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ ان تبصروں کا اس طرح خلاصہ درج کر دینے سے ہم نے اوّل الذکر کی گہری تحقیقات اور ثانی الذکر کی علمی و ماہرانہ خصوصیت کی کچھ داد نہیں دی۔ لیکن ان تینوں تجویزوں کے لب لباب کو چونکہ ہم تھوڑی سی جگہ میں محدود کرنے پر مجبور ہیں لہذا اب ہم بادل ناخواستہ تیسری تجویز کی طرف رجوع کرتے ہیں جو دنیائے ہند کے ایک ایسے طبقہ کی جانب سے پیش ہونے کے باعث جسے ہم اب تک عالم ظلمات میں بھٹکتا ہوا خیال کرتے تھے۔ ہماری خاص توجہ کی مستحق ہے۔

ہم شروع ہی میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تجویز جو پٹنہ سے پیش ہوئی ہے اور جس کی منسلکہ رسائل میں توضیح کی گئی ہے ہمیں نہایت دلکش معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام ادق اور ثقیل اصطلاحات نکال دی جائیں اور ان کے بجائے عام لوگوں کی بول چال کے الفاظ اختیار کرکے سائنس کی تعلیم میں آسانی پیدا کی جائے اور اسے عامۃ الناس کی دسترس میں کر دیا جائے۔ اور اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو سکتا کہ روزمرہ کی مبہم اور پوچ زبان کی اصطلاحیں وضع کرنے سے علمی ضبط وصحت کا خون نہ ہوگا تو ہم ضرور اس تجویز کی حمایت کرتے ہم اس میں تو کچھ شک نہیں کہ یہ طریقہ نہایت سادہ ہے۔ اور اگر اختیار کیا جائے تو ہمیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نہ تو عربی وسنسکرت علوم کی ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی حاجت ہے اور نہ سیدھی سادی دیسی بولیوں پر غیر زبان کے الفاظ کا بار ڈالنے کی ضرورت اور الفاظ بھی ایسے الفاظ جن کا نہ تو املا دیسی زبانوں میں صحیح طور پر لکھا جا سکتا ہے اور نہ دیسیوں ہی کے ناآشنا لب ان کا ٹھیک تلفظ ادا کر سکتے ہیں۔ بس طرح ہمیں صرف یہی کرنا ہوگا کہ غیر زبان کی ایک اصطلاح لے لی اور لوگوں کی عام بول چال میں اس کا مفہوم ظاہر کر دیا۔ اگر دانایان فرنگ اپنے حرارت ناپنے کے آلہ کو تھرامیٹر کہتے ہیں تو پٹنہ کے مترجم صاحب حکما ہندوستان کی آنے والی نسل کو یہ سکھانا چاہتے ہیں کہ وہ اس آلہ کو "گرمی ناپ" کے نام سے تعبیر کریں۔ اس موقع پر یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ اس دلاویز طریقہ کے وضع کرنے کا سہرا رائے سوہن لال منتظم نارمل اسکول پٹنہ کے سر ہے۔

ہندوستان کی دیسی زبانوں میں علمی اصطلاحات وضع کرنے کے لئے ہم تین تجویزوں کا خلاصہ درج کر چکے ہیں۔ اب اگر ہم غیر زبان کے الفاظ کو دیسی زبانوں میں لکھنے کا طریقہ اس پر مستزاد کریں تو ہم سمجھیں گے کہ یورپ کی جدید مصطلحات علمیہ کو ہندوستانی جامہ پہنانے کے تقریباً تمام ممکن ذرائع ہمیں معلوم ہو گئے۔ یہ طریقہ کچھ ایسا لغو ومہمل نہیں، لیکن یورپ کے بعض ماہرین تعلیم اکثر اوقات "کاہلانہ بے صبری" یا قومیت کے مغالطہ آمیز فخر کی وجہ سے اس طریقہ کی حمایت کرتے ہوئے اصوات واصول نحوی کی مناسبت کا کچھ لحاظ نہیں کرتے تاکہ ان کی مادری زبان کا پلہ کسی طرح بھاری رہے۔

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب طریقے تین درجوں میں منقسم ہو سکتے ہیں جن میں سے دو انتہائی حیثیت رکھتے ہیں اور تیسرا ان تینوں کے بین بین ہے۔ لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ مروجہ اصطلاحات

کے متعلق کوئی اختلاف رائے نہیں ہی اور موجودہ بحث کا تعلق صرف ان الفاظ سے ہی جن کے مترادف معلوم نہیں ہیں۔ یہ مترادف معلوم کرنے کے لئے ہمیں یا تو

(۱) مغربی اصطلاحات کو بجنسہٖ قایم رکھکر انھیں املا کے ایک وقت طلب طریقہ کے مطابق دیسی زبانوں میں منتقل کرنا چاہیئے۔ یا

(۲) اُس خزانۂ الفاظ کو جو عربی و فارسی میں مدفون ہے فراخ دستی وکشادہ دلی سے صرف کرکے ان اصطلاحوں کا دیسی زبانوں میں ترجمہ کرنا چاہیئے۔ اور یا

(۳) بعض مغربی مصطلحات بجنسہٖ قایم رکھنے اور بعض کا ترجمہ کرنے سے ان دونوں طریقوں کو مخلوط کر دینا چاہیئے۔

پہلا طریقہ ہرگز قابل التفات نہیں اس لئے بالکل نظر انداز کیا جاتا ہی۔ کوئی سمجھ دار ہندوستانی ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے اتفاق ظاہر نہیں کرے گا۔ اور نہ کوئی سمجھ دار یوروپین اس کا مؤید ہوگا۔ اس سے ہماری مادری زبان دوغلی بن جائے گی۔ ہم اس بات کا بہ آسانی اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس طریقہ پر عمل کرنے سے ہمارے آیندہ پنڈت لاطینی نما ہندوستانی لکھیں گے اور ہندی نما لاطینی بولیں گے۔ اس کا تصوّر ہی اس قدر مضحکہ خیز اور عجیب وغریب ہی کہ ذہنیات سے اس کو علمیات میں لانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ سوال فی الحقیقت صرف یہ رہ جاتا ہے کہ آیا ہمیں مغربی علوم کی تعلیم صرف بواسطۂ انگریزی دینی چاہیئے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہی تو سب الفاظ کا املا دیسی حروف میں لکھنے کے طریقہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدینا چاہیئے۔

بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انگریزی اصطلاحات عوام سے خراج مقبولیت حاصل کرسکیں گی جو ہمیں بالکل محال نظر آتا ہی تو پھر بھی اس طریقہ پر یہ سخت اعتراض وارد ہوتا ہی کہ وہ الفاظ جو اپنے اصلی ماخذوں سے بالکل منقطع اور دیسی زبان کے متسلین کی نظر میں ہمیشہ اجنبی رہیں گے اور متعلمین پر اتنے ہی گراں گزریں گے جتنے کہ چینی زبان کے حروف تہجی سوائے چینیوں کے اور سب پر گراں گزرتے ہیں۔

اب ہم ترجمہ کی بحث کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ اور اس اصول کو ایک بدیہی صداقت سمجھکر ہم یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ ترجمہ میں ہمیں ہمیشہ سادگی یکسانی اور صحت کو لحوظ خاطر رکھنا چاہیئے۔ اب سوال یہ ہی کہ ان تینوں شرائط کو نہایت پابندی کے ساتھ پورا کرنے کے لئے ہمارے طریق عمل کے اصول موضوعہ کیا ہوں اور ہماری

ہبری کے لئے کیا قواعد مقرر کئے جائیں؟ اس سوال کا شاید یہ جواب ہو سکتا ہی:-

(۱) مفرد اشیا کے تعبیر کرنے میں مفرد الفاظ کو مرکب الفاظ پر ترجیح دینی چاہیئے۔

(۲) وہ مصطلحات جو اشیا متذکرہ کی کوئی خاصیت ظاہر کرتی ہیں ان اصطلاحات پر جو کوئی خاصیت ظاہر نہیں کرتیں مرجح ہیں۔

(۳) اگر ہندوستانی متعلم کے لئے انگریزی اصطلاح اور اس کے ترجمہ میں برابر کا اشکال ہو اور ایک کو دوسرے پر کچھ بھی فوقیت نہ ہو تو یکسانی کی خاطر دیسی اصطلاح کے بجائے انگریزی اصطلاح قایم رکھنی چاہیئے۔

(۴) مرکب اشیاء کے تعبیر کرنے میں مرکب اصطلاحات کو ترجیح دینی چاہیئے اور یہ اصطلاحات ایسی ہوں کہ مرکب کے اجزا پر بھی کچھ روشنی ڈال سکیں۔

(۵) ایک ہی قسم کی چیزوں کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ہی قسم کے مرکبات و مشتقات کو مرجح سمجھنا چاہیئے۔

(۶) مروجہ اصطلاحات میں خواہ یورپی ہوں یا ایشیائی کوئی ایسی اصطلاح قایم نہیں رکھنی چاہیئے جو کسی شی کی نوعیت یا خاصیت کی نسبت غلط خیال پیدا کرتی ہو۔

ممکن ہی کہ یہ قواعد ناکافی ہوں اور شاید ان میں کسی قدر ردو بدل کی بھی ضرورت ہو، لیکن ان سے ہمیں اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہی کہ اگر ہم ایک قلیل مدت میں اپنی زبان کے لئے وہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ جسے مغربی زبانوں کے لئے کرنے میں عمریں صرف ہو گئیں ہیں تو ہمارے طریق عمل کی حدود ہونی چاہئیں۔ ہم یہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہمارا اصول سادگی یکسانی اور صحت ہونا چاہیئے۔ سادگی اور صحت تو شاید پیدا کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہندوستانی زبانوں کی اس کثرت کی صورت میں یکسانی کیوں کر پیدا کی جائے گی؟ ہم دُور کیوں جائیں خود ہمارے چھوٹے سے صوبہ میں اُردو اور ہندی کے جھگڑے کا کیا تصفیہ ہوگا؟ کیا ایک صوبہ کے لئے ہم دو قسم کی اصطلاحات مقرر کریں؟ اس مشکل کا پورا احساس ان دونوں فضلا میں سے جن کے تبصرے اس رسالے کی اشاعت کے محرک ہیں کسی کو بھی نہیں ہوا۔

کچھ عرصہ ہوا اُردو اور ہندی کے مسئلہ پر ایک گرم مباحثہ عام ہوا تھا جس میں ناظرین کو یاد ہوگا کہ سرسید احمد خاں سی ایس آئی نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ ہم اس بحث کو یہاں دوبارہ نہیں چھیڑنا چاہتے۔ لیکن عربی اور سنسکرت کی

ذاتی خوبیوں کے متعلق ہمیں چند الفاظ ضرور کہنے چاہئیں کیوں کہ ہمارے موجودہ مبحث سے اس مسئلہ کو بہت بڑا تعلق ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں زبانوں کے ادبی ذخائر ناپیدا کنار ہیں۔ خوبی کلام، فصاحت معانی، اور خالص فلسفیانہ نکات کی چھان بین کے لئے سوائے یونانی کے دنیا کی باقی تمام زبانوں میں یہ اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ لیکن اگر ان دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ نوع انسانی کی اُن دو بڑی آبائی نسلوں کے دماغ، خصائل، جذبات اور تاریخ میں ہے جن کے اجتماعی، اخلاقی، ذہنی اور تمدنی تجربہ کی یہ مظہر ہیں۔ خیالات کے صحیح اظہار اور تعین کے لئے یہ دونوں زبانیں اپنی اپنی جگہ نہایت موزوں ہیں۔ لیکن سنسکرت کو عربی پر یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس میں الفاظ کے بے شمار مرکبات و مشتقات بن سکتے ہیں اور آگے پیچھے الفاظ بڑھا کر ان میں کئی طرح سے تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس بات کے اعتراف کرنے سے ہم لوگوں کی انانیت کو (جو اردو بولتے ہیں) صدمہ ضرور پہنچتا ہے لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ زبان عربی اس لحاظ سے نہایت کم مایہ ہے۔ اس میں صرف ایک سابقہ "ال" اور ایک لاحقہ "ی" ہے۔ اس میں مرکب الفاظ بنانے کی صلاحیت بہت کم ہے اور یہ اس لئے کہ اس کے مرکبات کی صرف چار قسمیں ہیں جن میں سے دو ہمارے اغراض کے لئے محض بیکار ہیں۔ مشتقات کے لئے تو یہ قاعدہ کلیہ مقرر ہے کہ داخلی حروف علت کو بدل دیا جائے (اور سامی زبانوں کا یہ ایک امتیاز خصوصی ہے) لیکن نئے الفاظ بنانے کے لئے اس میں کوئی ایسا لچکدار قاعدہ موجود نہیں جو ہر حالت میں کام دے۔ جو مرکب الفاظ اس زبان میں بن سکتے ہیں انہیں ہم سوائے ایک مشتبہ استثنا کے واحد کلمہ صرفی قرار ہی نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ ان مرکبات کے اجزا کی انفرادی و ابتدائی حیثیت بدستور قایم رہتی ہے اور انھیں الگ الگ ہی سمجھنا پڑتا ہے۔

یہ ہے وہ مدد جو اُردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں ہمیں عربی سے مل سکتی ہے۔

ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ عربی زبان بعض صرفی اور لسانی خصوصیتوں کی وجہ سے مرکب اور مشتق الفاظ بنانے میں اتنی مفید امداد نہیں دے سکتی جتنی سنسکرت دے سکتی ہے۔ اگر گنجایش ہوتی اور ہم یہ سمجھتے کہ عربی کے کثیر الفاظ کا انگریزی حروف میں لکھنا ایک انتہا درجہ کا محنت طلب کام نہیں ہے تو ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں بے شمار مثالیں پیش کرتے جنھیں عربی داں حضرات جھٹلانے کی کبھی جسارت نہیں کر سکتے۔ اس زبان کو (جس کا خود راقم بڑا مداح ہے) اس نقص صریح کا ملزم قرار دینے کے بعد اب انصاف یہ ہے کہ ہم دوسرے پہلو پر بھی روشنی ڈالیں۔

یہ ایک مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے کہ اندلس اور شام کے عرب یورپ کی علمی ترقی کے ابوالآبا تھے۔ اس زمانہ میں جبکہ دُنیا کے اور لوگوں پر دماغی ظلمت کی گھٹا چھائی ہوئی تھی عرب وادی الکبیر اور فرات کے کناروں پر علمی وادبی مشاغل میں مصروف تھے۔ جربرٹ کی طرح جو بعدازاں پوپ سلوسٹر کے نام سے مشہور ہوا مسیحی طلبہ صدیوں تک مسلمان فلسفیوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے اور علم وفضل میں اعجوبہ روزگار بن کر اپنے وطن کو لوٹتے رہے ہیں۔ ابن رشد اور ابن سینا کی تصانیف صدہا سال تک مغربی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شریک رہے ہیں اور پروفیسروں نے اپنے مسیحی شاگردوں کو ان ہی کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے۔ یہی عرب یونانی علوم کے امین اور یونانی تہذیب کے محافظ اور حامل تھے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو یورپ کی وہ ادبی اور علمی دولت جو اس کے عروج کا باعث ہوئی کبھی نصیب نہ ہوتی۔ بلکہ خود یہ عروج ایک غیر معین عرصہ تک رُکا رہتا۔ وہ اپنے یونانی اُستادوں کی کچھ کورانہ تقلید بھی نہیں کرتے تھے گو اُن کے عیب جو کبھی کبھی اُن پر یہ الزام لگانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ وہ یکے بعد دیگرے تحقیق کے ہر میدان میں قدم رکھتے تھے۔ ہیئت اور طب کا مطالعہ وہ نہایت شوق سے کرتے تھے۔ علم المناظر اور جرثقیل میں اُنھوں نے ایسی ایجادیں کی ہیں جن کی بیکن کے زمانہ سے بعد کے لوگ پُوری قدر نہیں کر سکتے۔ کیمیاگری کے بے سود انہماک سے انھوں نے اصلی علم کیمیا کی بنیاد رکھی۔ جعفر نے شورے کا تیزاب اور ماء الملوک دریافت کیا۔ اسی شخص نے سب سے پہلے یہ بات عالم آشکار کی کہ دھات مکلس ہو کر بھاری ہو جاتی ہے۔ گندھک کا تیزاب اور الکحل اوّل اوّل رازی نے بنایا اور ایک بعد کے موجد نے فاسفورس جیسی ضروری شے پہلے پہل تیار کی۔ لنگر کی حرکت سے وقت کا اندازہ کرنا بھی ایک عربی ایجاد ہے۔ اور وہ شخص جس نے مساوات درجہ دوم کے حل کا معمولی طریقہ دریافت کیا ایک عرب ریاضی داں ہی تھا ہیئت اور طبعیات میں ریاضی کے استعمال کے محرک اوّل بھی عرب ہیں۔ ارضیات، نباتات، حیوانات اور معدنیات کے تو وہ بانی ہی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ عرب جرّاح نہایت مہارت اور صفائی سے عمل جرّاحی کرتے تھے۔ اور آلات جرّاحی بھی رائج تھے۔ سفر و سیاحت کے شوق نے ان کی قرابادین کو بہت وسیع کر دیا۔ اور ادویہ میں بھی معتد بہ اضافہ ہوا جن سے انھوں نے خوب کام لیا۔ ڈریپر لکھتا ہے کہ "طب کے نظری اور عملی مسائل میں جہاں تک افعال اعضائے انسانی کی تصریح اور معالجۂ امراض کو تعلق ہے۔ کیمیا کا استعمال طب میں عربوں نے شروع کیا۔ جرّاحی میں بھی وہ اپنے طبّی علم سے کچھ کم نہ تھے۔ ابو القسیس قرطبی خود اپنے فن اور نیز فن

دایہ گری کے نہایت نازک عمل جراحی انجام دینے میں ذرا بھی نہ جھجکتا تھا۔ وہ بلا تامل چاقو استعمال کرتا اور گرم سلائی کی داغ لگاتا تھا۔

علم المناظر میں ابن ہیثم کے اکتشافات فی الحقیقت ایک بلند پایہ رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی شخص نے بینائی کی صحیح تشریح کی اور یہ بتایا کہ شعاعیں مرئی اشیا سے منعکس ہو کر آنکھوں کے پردہ شبکیہ پر پڑتی ہیں اور ان کا اثر بذریعہ عصبۂ مجوفہ دماغ تک پہنچتا ہے۔ وہ دو آنکھوں کو ایک ہی چیز کے دکھائی دینے اور فریب ہائے نظر کی نوعیت سے کامل طور پر آگاہ تھا اور ان واقعات کے اسباب و علل کو بھی بخوبی جانتا تھا۔ اسی شخص نے اول اول یہ بات معلوم کی کہ کرۂ ہوا کی کثافت ہر جگہ یکساں نہیں ہے اور اس لئے روشنی کی آڑی شعاعیں ہوا میں سے گزرتے ہوئے منحنی اور زمین کی جانب مقعر ہو جاتی ہیں۔ کرۂ ہوا میں انعطافِ نور کے اس عظیم الشان کلیہ سے اس نے شفق، تاروں کے جھلملانے، اور افقی حالت میں عمودی قطرِ شمس و قمر کے بظاہر کم ہو جانے کی تشریح کی۔ انھیں اکتشافات سے کام لے کر اس نے کرۂ ہوا کی بلندی دریافت کی اور اس کی حد تخمیناً ۵۰ میل مقرر کی۔ جرثقیل اور سکونیات سیالی میں بھی اُن کے اکتشافات اسی قدر اہمیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ہماری میز پر "جرثقیل"، "علم المناظر"، اور اسی نہج کے چند اور عربی رسائل موجود ہیں۔ گو دتو یہ رسالے نہایت مختصر ہیں لیکن ان میں ایسی بڑی بڑی کتابوں کے جا بجا حوالے دیئے گئے ہیں جو آج کل ہر جگہ بالخصوص ان ملکوں میں مطلقاً معدوم ہیں۔ گو یہ رسالے مختصر ہیں لیکن ان سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ عرب بڑی بڑی قوائے آلیہ کو خوب اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، ان کے استعمال اور اُن تمام حالتوں سے بخوبی واقف تھے جن میں طاقت کم لگانی پڑتی ہے۔ ہم نے "میزان الحکمت" جو ابن ہیثم کے نام سے منسوب کی جاتی ہے خود تو نہیں دیکھی لیکن اگر ڈریپر اور موسیو خانیکوف کی شہادت معتبر خیال کی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ طریسلی کی مشہور ایجاد سے کئی سو سال قبل ابن ہیثم نے کرۂ ہوا کے وزن اور زیادتی کثافت کے باہمی تعلق کو کتاب مذکور میں واضح طور پر بیان کر دیا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ کثیف واسطہ میں اشیا کا وزن گھٹ جاتا ہے اور مرکز جاذبہ کے اصول اور تیرنے والے اجسام کی کنہ سے بھی وہ آگاہ تھا۔ لنگر دار گھڑی اور مایع پیما بھی اسے معلوم تھے۔ مؤخر الذکر سے اس نے اجسام کی کثافتِ اضافی دریافت کی۔ علم الحیات میں تدریجی ترقی کے اصول کا جس سے یورپ کے حکما اب روشناس ہوئے ہیں وہ موئد تھا۔ ابن سینا نے اپنے زمانہ میں قشرۃ الارض کی ساخت کی تشریح کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس اکتشاف کو اب النسٹڈ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

علوم و فنون کے اُن میدانوں کا خاکہ کھینچنے میں جن میں قدیم زمانہ کے عربوں نے قدم رکھا تھا ہم نے بہت سی جگہ صرف کی ہے اور ناظرین کے صبر کا کافی امتحان لیا ہے اور یہ اس غرض سے کہ یورپ اور عرب کے علوم میں جو نمایاں باہمی قربت ہے وہ ثابت ہو جائے۔ ہم یہ بعد میں بتائیں گے کہ اس امر کو ہم اس قدر اہم کیوں سمجھتے ہیں۔

فی الحال ہمارا مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ مغربی اصطلاحات کا اُردو، ہندی یا بنگالی میں بہترین ترجمہ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ بنگالی یعنی بنگال کی ہندی ہمارے صوبہ کی ہندی کی طرح سنسکرت ہی میں سے پیدا ہوئی ہے۔ اور اس میں اتنی لچک ہے کہ مترجم نئے الفاظ گھڑنے کے لئے اسے حسب ضرورت استعمال کر سکتا ہے۔ نئی اصطلاحیں ایک دفعہ بنگالی یا ہندی میں داخل ہونے کے بعد ان زبانوں کا جزو بن جاتی اور قدیم زمانہ کے اختیار کردہ الفاظ کی طرح کام دیتی ہیں۔ لیکن زبانِ اُردو اس مداخلت کی اس وقت تک متحمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے موجودہ نظام میں ایک اصولی انقلاب پیدا نہ ہو جائے اور اُردو داں حضرات ہندی کی طرف زیادہ مائل نہ ہوں ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی یہ تبدیلی ہمارے لئے باعثِ مسرت ہوگی۔ کیوں کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ اُردو اور ہندی میں جتنا زیادہ اتحاد و تطابق ہوگا۔ اتنا ہی اُردو کو فائدہ پہنچے گا۔ لیکن ہمیں خوف ہے کہ اس قابلِ قدر مقصد کے پورا ہونے میں بہت عرصہ لگے گا گو اس کی انتہائی کامیابی میں ہمیں مطلق شبہ نہیں جب تک ہندوستان کے مسلمان اپنے اختیار کردہ وطن میں اپنی حیثیت کا غیر منصفانہ خودغرضانہ خیال ترک نہ کر دیں سامی عنصر ہماری مادری زبان میں غالب رہے گا مسلمان جب یہ سمجھنے لگیں گے کہ وہ ہندی پہلے ہیں اور عرب بعد میں یعنی جب انھیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ ہندوستان کی متحدہ قومیت میں وہ کوئی غیر عنصر نہیں جو اتحاد میں حارج ہو بلکہ اسی کا ایک جزو ہیں۔ جب وہ عربستان اور عربوں کے بجائے ہندوستان اور ہندوؤں کو اپنی برادری کے لئے منتخب کریں گے تو اس وقت مشترکہ زبان اور متحدہ قومیت کا خواب پورا ہوگا۔ لیکن ہمیں موجودہ حالات سے خواہ وہ کیسے ہی ہوں پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کے لئے یکساں اصطلاحات وضع کرنا فی الحال ناممکن ہے۔ اور مؤخرالذکر کو علاوہ سنسکرت کے دیگر ذرائع سے بھی کام لینا چاہیئے۔

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اکثر بڑے بڑے علوم کی ابتدا جو ترجمہ کے قابل ہیں عربی میں ہوئی ہے اور جس قدر اصطلاحیں ان علوم کے مبادیات کے لئے ضروری ہیں تحقیقات سے عربی میں معلوم ہو سکتی ہیں۔ عربی ماخذ سے ہماری علمی لغت

میں بہت بڑا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے موجودہ اہل فرنگ بھی عربوں کے علمی انہماک کا اعتراف کرتے ہوئے منفعل نہیں ہوتے اور الکحل، الکمی (کیمیا) الجبرا، زینتھ (سمت) ناڈر (نظیر) الیکسر (اکسیر) سرپ (شربت) جولپ (جلاب) اور اسی قسم کے متعدد الفاظ بکثرت استعمال کر کے اپنی ممنونیت ظاہر کرتے ہیں تو ہم اس ذخیرہ کی تحصیل سے فائدہ اٹھانے میں کیوں تامل کریں؟ ان الفاظ کی تعداد کا صحیح اندازہ جو اس طرح مل سکتے ہیں کوئی شخص اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ حاجی خلیفہ کی تصنیف یا "مدینۃ العلوم" کی کتاب ملاحظہ نہ کرے جس میں کتابوں کی تاریخ درج ہے اور جب تک اسے ان مضامین کا علم نہ ہو جن پر عربوں کی توجہ مبذول رہی ہے اس کے ساتھ ہی ان الفاظ کو کوئی شخص اس وقت تک قابل استعمال نہیں بنا سکتا جب تک کہ عربی کی تمام موجودہ علمی کتابوں کا ذخیرہ فراہم کر کے اس کو لایق علما کی ایک جماعت میں پیش نہ کر دے۔

علاوہ ازیں ایک اور ایسا ماخذ ہے جس سے زبان اردو بلا تکلف الفاظ مستعار لے سکتی ہے اور عربی اس کی بےحد ممنون احسان ہے ہمارا اشارہ یونانی زبان کی طرف ہے۔ ڈاکٹر تمیز خاں کے علمی ذوق اور باریک بین نگاہ نے اس نکتہ کو نظر انداز نہیں کیا۔ ان کا یہ خیال ہے کہ تمام یونانی الاصل الفاظ جو طب اور دوسرے علوم میں مستعمل ہیں اس قدر ترمیم کے ساتھ جو ہماری زبان کی ضروریات کے لحاظ سے لازم ہو اختیار کر لینے چاہئیں۔ کیوں کہ قدیم زمانہ کے عربوں نے یہ الفاظ مستعار لے کر ہمارے لئے ایک مثال قایم کر دی ہے اور یہ خیال ہے بھی صحیح۔

ان زبانوں کے علاوہ فارسی ہماری زبردست معاون ہو گی۔ اس سے ہمیں بے شمار الفاظ دستیاب ہوں گے اور چوں کہ یہ ہندی اور اردو دونوں سے نہایت قریبی تعلق رکھتی ہے اس لئے اس حالت میں جب کہ ہمیں دیگر ذرایع سے ثقیل اور مغلق الفاظ ملتے ہوں یا الفاظ مطلق نہ ملتے ہوں یہ بے حد کارآمد ثابت ہو گی۔ مرکبات اور مشتقات بنانے کا بھی اس میں ایک نہایت عمدہ قاعدہ ہے جو اردو کے مروجہ قواعد سے اس قدر مشابہ ہے کہ اس نیم اجنبی ماخذ کے نئے الفاظ سے بھی ہم بہت جلد مانوس ہو جائیں گے۔

الغرض اپنی ضروریات کے لئے ہم حسب ذیل الفاظ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں:-

(۱) سنسکرت، عربی، فارسی، اور ان مغربی الاصل الفاظ سے جو ہماری زبان میں مروج ہیں۔

(۲) مصطلحات سے جو عربی کی کتابوں میں مذکور ہیں لیکن عام طور پر استعمال نہیں ہوتیں۔

(۳) عربی کے مرکبات و مشتقات سے جو خاص قواعد کی پابندی سے وضع کئے جائیں۔

(۴) یونانی یا لاطینی اصل کی علمی اصطلاحوں سے جن میں بہ تقلید اہل عرب ہماری زبان کی صوتی خصوصیات کے موافق ترمیم ہو جائے۔

(۵) مفرد مشتق یا مرکب الفاظ سے جو فارسی سے مستعار لئے جائیں۔

اب ہم اپنے مجوزہ طریقہ کی مفصل توضیح کے لئے ہر قسم کی چند مثالیں پیش کریں گے۔

(۱) پہلی قسم کی الفاظ کی مثالیں ہر شخص کو سوجھ سکتی ہیں۔ مثلاً کیمیا میں فلز یا دھات (Metal) قرع انبیق (Alembic or retort) اور تیزاب (Acid) وغیرہ الفاظ مستعمل ہیں علم تشریح الابدان اور طب میں قلب یا دل (Heart) ریہ شش یا پھیپھڑا (Lungs) طحال تلی یا پتہ (Spleen) کبد یا جگر (Liver)، دماغ (Brain) رگ یا نس (Vein) بحران (Crisis) تپ (Fever) مدر (Diuretic) مسہل (Purgative) ملین (Apperient) اور اسی قسم کے کئی اور الفاظ سے اردو داں حضرات بخوبی واقف ہیں۔ طبعیات اور ہیئت میں زور یا بل (Force)، حرکت یا چال (Motion) وزن ثقل یا بوجھ (Weight) حرارت یا گرمی (Heat) سیارہ (Planet) ثوابت (Fixed Stars) افق (Horizon) وغیرہ الفاظ موجود ہیں۔

(۲) دوسری قسم کے الفاظ ایسے ہیں جیسے کیمیا میں ملحیات (Saline bodies) دہنیات (The Firedoil) (Porc...) مائع (Liquid) سیال (Fluid) بخار (Vapour) وغیرہ یا جیسے علم تشریح الابدان اور طب میں شریان (Artery) اعصاب (Tendons) عضلات (Muscles) جمجمہ (Skull) اجواف (Cavities) غدود (Glands) مشیمہ (Secondines) مخدرات (Palliatives) استسقاء (Dropsy) استرخا یا فالج (Paralysis) نطول (Fomentation or embrocation) وغیرہ یا طبعیات و ہیئت میں بیرم (Lever) بکرۃ (Pulley) مرکز (Fulcrum) تعدیل (Equilibriun) محور (Axis) ارتفاع (Altitude) طول بلد (Longitude) عرض بلد (Latitude) جیب (Sine) وغیرہ۔

(۳) تیسری قسم کی ہم صرف چند ہی مثالیں بیان کریں گے۔ اگر ناظرین زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو

انہیں علم تشریح الابدان پر ڈاکٹر ٹائٹلر کی قابل قدر عربی تالیف یا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ اور مولوی کمال الدین لکھنوی کے تراجم ملاحظہ کرنے چاہئیں۔ لیکن ہم ان الفاظ کے مسترد کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں جو ذوق سلیم یا قواعد صرف کے خلاف وضع کئے گئے ہوں۔ اس قسم کی مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

مقیاس الحرارت	(Thermometer)
حاصل القوا	Resultant of forces
ثنائی الترکیب	Diatomic Substances
ثلاثی الترکیب	Triatounic
تکاثف	Density
معیار	Test
علم السکون	Statics
علم الحرکت	Dynamics
حرکت عمودی	Vertical motion
افقی	Horizontal
وضع افقی	Horizontal position

وضع اصطلاحات میں اس سے بہتر اختراعات بھی کی جا سکتی ہیں لیکن ہمارے مقصد کے لئے یہی کافی ہیں۔

(۴) چوتھی قسم کے الفاظ ان نمونوں کے مطابق اختیار کئے جا سکتے ہیں جو پہلے ہی سے موجود ہیں۔ مثلاً عرب Cornea کے لئے قرنیہ Diabetes کے لئے ذیابیطس یا ذیابیطس (Storax) کے لئے اصطرک Astrolabe کے لئے اصطرلاب۔ اور Is a gogue کے لئے ایساغوجی استعمال کرتے ہیں۔ اور اسما معرفہ میں (Euclid) کو اقلیدس Pythagoras کو فیثاغورث اور (Socrates) کو سقراط کہتے ہیں۔ ہم بھی اسی طرح سے ان کی تقلید کرتے ہوئے Morphia کے لئے مرفیہ Cryolite کے لئے قرولطیس Crystal کے لئے کرسٹل یا کرسطلس (جو یونانی زبان کے مروجہ لفظ اسطوخودوس کی طرح بنا سکتے ہیں Hyperstene کے لئے

حیفرسطینواور Magilus کے لئے مجلیس استعمال کرسکتے ہیں۔ ہم diaplase کو دیاپلس Spar کو اسپار یا اسپات Cromine کو بِرومین اور Iodine کو یودین کہہ سکتے ہیں علیٰ ہٰذا القیاس۔ ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جن الفاظ کا صحیح تلفظ ہم نے بدل دیا ہے وہ بعینہٖ اسی صورت میں اختیار یا قبول کر لیا جائے اور نہ ہم قدرت رکھتے ہیں کہ مغربی الفاظ کا املا دیسی زبان میں صحیح طور سے لکھ سکیں۔ ہم نے محض اس اصول کی تشریح کے لئے رواروی میں چند مثالیں پیش کر دی ہیں کہ مغربی الفاظ جو مستعار لئے جائیں ہماری صوتی ضروریات کے موافق بدل دیئے جائیں تاکہ دیسی زبانوں کے علماء کے ہاتھوں ان کی زیادہ گت نہ بنے اور جہاں تک صحت لفظی کو تعلق ہے ان کی بے شمار جداگانہ شکلیں پیدا نہ ہوں۔ ٹیکس، کورٹ، اپیلانٹ، رسپانڈنٹ، وغیرہ الفاظ کی عوام کی زبان پر آ کر جو ہیئت کذائی ہو گئی ہے اس سے ہم واقف ہیں اور ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ ان الفاظ نے کس قدر بوقلموں بھونڈی شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ اس سے ہمیں متنبہ ہو جانا چاہیئے کہ غیر زبان کے تمام الفاظ بجنسہٖ اپنی زبان میں لے لینا کتنا نقصان دہ ہے۔ ہمیں نئی اصطلاحات کے صرف انتخاب ہی میں نہیں بلکہ ان میں اپنی زبان کا ٹکسالی روپ پیدا کرنے میں بھی یہ دانشمندانہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ ان الفاظ کی اصلی خوبو ہمیشہ باقی رہے۔ اور لوگوں میں ان کی بگاڑی ہوئی صورتیں رائج نہ ہونے پائیں۔

(۵) پانچویں قسم کی صدہا مثالیں دی جا سکتی ہیں (Air-pump) کے لئے بادکش، (Water-pump) کے لئے آب کش، (Anthropomorphus) کے لئے آدمی پیکر، (Pachydermata) کے لئے سخت جلد وغیرہ الفاظ گھڑ سکتے ہیں (Caly) کا ترجمہ ہم برگ بیرونی کر سکتے ہیں اور (Corolla) کا برگ اندرونی ہم ناظرین کو یہاں پھر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان اصطلاحات کو ہم الفاظ مذکور کا موزوں ترین ترجمہ ہرگز تصور نہیں کرتے۔ ہم نے تو چند توضیحی مثالیں پیش کی ہیں اور بس۔ اگر انتخاب کا مسئلہ واقعی درپیش ہو تو شاید ہم بلحاظ اختصار و ضاحت عربی یا ہندی الفاظ کو ترجیح دیں۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ مجوزہ طریقہ پر عمل کرنے سے سب سے بڑی مشکل کا سامنا ان اصطلاحات کے تصفیہ میں ہوگا جن کا ترجمہ سوائے ادق لغات یا طویل مرکبات استعمال کرنے کے ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جنھیں یاد رکھنے کے لئے حافظہ پر بہت بار پڑتا ہے۔ ہم پر یہ امر بھی بخوبی روشن ہے کہ ان تراجم کا ایسے نکتہ چین حضرات بے حد مضحکہ اُڑائیں گے جو اس طریقہ پر خود کبھی طبع آزمائی کرنے کی وجہ سے اس کی عظیم مشکلات کا صحیح اندازہ کرنے کے ہرگز اہل نہیں لیکن

ہم وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ جن قواعد کے مرتب کرنے کی ہم نے جرأت کی ہے ان پر بہ پابندیِ تمام عمل پیرا ہونے سے یہ مشکل اوّل تو بالکل جاتی رہے گی ورنہ کسی حد تک کم تو ضرور ہو جائے گی۔ اگر مفرد الفاظ مل سکیں تو ہمیں طویل مرکبات کو مسترد کر دینا چاہیئے اور اس طرح وضاحت یا لفظی مفہوم کو اگر خفیف سا صدمہ بھی پہنچ جائے تو اس کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن ہمیں کوئی قابلِ اعتراض لفظ اختیار کرنا ہی پڑے تو اُسے بدرجۂ مجبوری قبول کرنا چاہیئے اور تا حد امکان اسے کارآمد بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمارا خیال ہے کہ عربی کے بھونڈے مرکب الفاظ بھی بعض اوقات تھوڑی سی قوت تمیزی صرف کرنے سے کسی قدر موزوں بن سکتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ٹا لٹر نے (Stytloglossus) کے لئے لفظ مشکلیۃ لسانیۃ استعمال کیا ہے۔ اگر یہی لفظ رکھنا منظور ہو تو ہم اسے بدل کر لسانیۃ مشتل بنا سکتے ہیں (Sublingual glands) کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اتنا بڑا لفظ تجویز کیا ہے کہ اس کا تلفظ ادا کرنے میں جتنا وقت لگتا ہے اس سے کم وقت میں علم طب کا ایک متوسط طالب علم جو فوجی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اپنے آلۂ جراحی سے کام لے کر ان غدوودوں کا وجود ثابت کر سکتا ہے۔ لیکن صرف کے سخت قواعد سے کسی قدر انحراف کے بعد اگر ان غدودوں کو تحتانیہ غدین اللسانی یا غد تحت اللسانی کہا جائے تو اس لفظ میں کافی اختصار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اکثر حالتوں میں جب ایسے چھوٹے کلمے مطلوب ہوں جو آسانی سے یاد رہیں اور بلا دقت بولے جا سکیں تو عربی میں مرکبات مزجی یا امتزاجی اور بنائی کی قسم کے اسماء معرفہ وضع کرنے کے قاعدہ کے مطابق بہت سے الفاظ ایک کلمۂ واحد کی شکل میں ضم کئے جا سکتے ہیں۔ اس پر عربی کے علماء اور دیگر ثقات کو بھی چیں بہ جبیں ہونے کا موقع نہ ملے گا۔ کیوں کہ اس تجویز سے ان کی چہیتی قدیم زبان کے تقدس پر حملہ کرنا مقصود نہیں اور اگر ہم کسی خلاف محاورہ غلطی کے مرتکب ہوں تو انھیں پُورا اختیار رہے کہ اسے ہماری زبان اُردو کے کھاتے میں ڈال دیں جس کا شمار کلاسیکل زبانوں میں نہیں ہے۔

ہم یہ پہلے کہہ چکے ہیں کہ بوقت ضرورت ہم فارسی جیسی لطیف زبان سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کی حقیقی مشکلات شاذ و نادر ہی پیش آئیں گی۔ ہر حالت میں خوش مذاقی اور موزونیت کا اصول مدنظر رکھنے سے مترجمین کو بہترین الفاظ کے انتخاب میں مدد ملے گی۔ اصلی الفاظ کا قایم رکھنا مترجمین کا آخری چارہ کار ہونا چاہیئے اور وہ بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں۔

لہٰذا مولوی تمیز خاں بہادر کی قابلیت اور پختہ تجربہ کا پورا احترام کرتے ہوئے ہم ان سے اختلاف ظاہر کرنے

پر مجبور ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں :-

"میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ محض سنسکرت، عربی، یا فارسی لفظ کے جاننے سے ہمیں کسی چیز کا اس تصور سے کچھ بہتر تصور نہیں ہو سکتا جو اس کا انگریزی، لاطینی، یا یونانی نام سننے اور طالب علم کو یہ بتا دینے سے ہوتا ہے کہ فلاں لفظ فلاں شے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا۔ ہمارے کالج کے مختلف شعبوں کی تعلیم میں اور نیز دوسرے کالجوں میں بعینہٖ یہی بات نہایت کامیابی سے عمل میں آتی ہے۔ مگر اگر ہم کسی طالب علم سے یہ کہدیں کہ ایک خاص پٹھے کا نام بائی سیپس ہے یا ایک خاص عمل کو اسٹائلائیڈ کہتے ہیں یا وہ جسم ملفیٹک گلینڈ کے نام سے موسوم ہے اور اس کو ان الفاظ کا اشتقاق سمجھنے کی زحمت دیئے بغیر یہ بتلا دیں کہ فلاں نام صرف فلاں شے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کسی دوسری چیز کے لئے نہیں بولا جاتا تو ہم دیکھیں گے کہ وہ طالب علم اس کو اچھی طرح سے ذہن نشین کرتا اور یاد رکھتا ہے اور کسی دوسری چیز کے نام سے خلط ملط نہیں کرتا۔"

ہمیں نفسیات کا کوئی ایسا قانون معلوم نہیں جس سے ثابت ہو کہ جامد اسمار اور بے معنی مصطلحات معنی خیز اصطلاحوں یا ان الفاظ کے مقابلہ میں آسانی سے یاد رکھے جا سکتے ہیں جن کے مفہوم سے متعلم آگاہ ہو اور جنھیں وہ سلسلۂ خیالات کی کسی زنجیر میں منسلک کر کے اپنے حافظہ کے اندر محفوظ رکھتا ہو۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ کس مسلمہ اصول کی بنا پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ ایک مشرقی متعلم کے لئے جو بواسطۂ زبان اردو طبعیات اور طب کا اکتساب کر رہا ہو، ہندوستانی الفاظ ذات الراسین یا دوسرا اور بادکش کی نسبت بائی سیپس اور ایر پمپ کا یاد رکھنا زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ اگر بہ کثرت اختیار کئے جائیں تو ان پر حافظہ کو اتنی ہی محنت کرنی پڑے گی جتنی کسی زبان میں کمال حاصل کرنے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر معمولی طور پر کام کرنے کے باعث یہ قوت ضرورت سے زیادہ نشو و نما پائے گی جس سے دوسری ذہنی قوتوں کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کسی علم کی تحصیل میں اس کی اصطلاحات کا سمجھکر مطالعہ کرنے سے جو دماغی تربیت ہوتی ہے اسے ہم ہرگز حقیر نہیں قرار دے سکتے۔ حیوانیات نباتیات اور کیمیا میں اصطلاحات کا سمجھکر مطالعہ کرنا از بس ضروری ہے۔ اگر کوئی متعلم اصطلاحات کے اس طویل سلسلہ کو جو ان علوم میں آتا ہے مختلف اشیا کے نام تصور کرنے کے سوا اور کچھ نہ سمجھے اور ان کے اشتقاقی مفہوم و مطالب سے آگاہ نہ ہو تو ہمیں خوف ہے کہ ان بے شمار الفاظ کو رٹ لینے کے بعد بھی وہ ویسا ہی کورا رہیگا جیسا کہ پہلے تھا۔ اگر کسی ہندوستانی کو نباتات اور

حیوانات کی قسمیں یا کیمیائی مرکبات کے نام ترجمہ کرنے کے بغیر بجنسہ بنا دیئے جائیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ان پر پورا عبور کیوں کر حاصل کر سکتا ہے۔ ہماری ناقص رائے میں تو یہ بدرجہا بہتر ہے کہ وہ غیر زبان کے مسخ شدہ بھونڈے الفاظ کی تاریک بھول بھلیاں میں ٹامک ٹوئے مارنے اور مزید "روشنی" کے لئے تگ و دو کرنے کے بجائے مغربی علوم پڑھنے سے پہلے تھوڑی سی ابتدائی انگریزی بطور تمہید سیکھ لے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ عملی پہلو سے یہ طریقہ ایک حد تک کامیاب ہو سکتا ہے تو پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ لوگ جو اس طریقہ سے علم حاصل کریں گے اُسے دوسروں تک نہیں پہنچا سکیں گے اور اس لحاظ سے ان کی حالت بیچارے گریجوایٹوں سے کچھ بہتر نہیں ہوگی جن کی نسبت یہ بات ایک ضرب المثل ہوگئی ہے کہ وہ غیر ملکوں کے علوم اپنے ہم وطنوں کو سکھانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

تاہم اُس مشکل کو رفع کرنے کے لئے جس کا صاحب موصوف نے اپنی رائے میں ذکر کیا ہے اور جس کی تنقید کی ہم نے جرأت کی ہے۔ ہم اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ علمی کتب کے ترجموں میں ہر اصطلاح کا مغربی مترادف ہمیشہ انگریزی اور دیسی زبان کے حروف میں حاشیہ پر درج ہونا چاہیئے۔ اور اگر کوئی طالب علم دونوں قسم کی اصطلاحیں یاد کر سکے تو ہمیں اس پر کچھ اعتراض نہ ہوگا۔ خود ڈاکٹر تمیز خاں بھی اس تجویز کے پرجوش حامی ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ وہ دونوں قسم کی اصطلاحات کی جگہ بدل کر جدید وضع کردہ الفاظ کو متن کے ساتھ بطور حواشی درج کرنا چاہتے ہیں۔

اب ہم دوسرے لوگوں کے کام پر جو اس وقت تک ہو چکا ہے ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ ترجمہ میں افضلیت کے پہلے حقدار عربی کے عالم متبحر ڈاکٹر ٹائٹلر ہیں جنھوں نے ڈاکٹر ہوپر کی کتاب "اناٹومسٹس ویڈی میکم" کا عربی ترجمہ کرکے اپنے علم و فضل اور حیرت انگیز استقلال کی ایک یادگار قایم کردی ہے۔ اس کتاب نے صحت عبارت اور عربی کے قدیم ادب سے پوری مطابقت رکھنے کے باعث جو اس کا امتیاز خصوصی ہے مسلمانوں میں خاص طور پر مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور اس سے ہمارے طبیبوں کو اتنا حقیقی فائدہ پہنچا ہے کہ کسی اور ترجمہ سے نہ پہنچا ہوگا۔ اب تو یہ قریب قریب ایک درسی کتاب بن گئی ہے۔ اور کمال شوق سے پڑھی جاتی ہے ڈاکٹر ٹائٹلر کی "جاں کاہی و عرق ریزی" کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تمیز خاں نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ:-

"اُس عالم متبحر نے مشرقی طلبہ کو عربی زبان کے ذریعہ سے مغربی طب کی تعلیم دینے کے لئے نہ صرف ہوپر کی پوری کتاب "اناٹومسٹس ویڈی میکم" کا "انیس المشرحین" کے کسی قدر شاعرانہ نام سے پاکیزہ عربی میں ترجمہ کیا ہے بلکہ

اس زمانہ کے طبی ادب کا محنت اور استقلال سے مطالعہ کرنے کے بعد جس کا ہم بے حد احترام کرتے ہیں علمی اصطلاحات کی ایک لغت بھی اس کے ساتھ ضم کی ہے۔ اس لغت کا حجم ڈیڑھ سو صفحہ ہے۔ اور ہر صفحہ پر اکیس اصطلاحیں درج ہیں۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈاکٹر ٹائیلر نے تشریح الابدان، عضویات علم تشخیص، طب جراحی وغیرہ کی بائیس سو سے زیادہ اصطلاحات جمع کی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ان کے عربی مترادف دیئے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ان اصطلاحوں کا بیشتر حصہ ڈاکٹر ٹائلر نے بظاہر اپنی ذاتی کوشش سے وضع کیا ہے۔" آگے چل کر ڈاکٹر تمیز خاں لکھتے ہیں کہ:-

"اگر میں اصطلاحات کے اس ترجمہ کو موزوں اور عمدگی سے انتخاب کیا ہوا نہ کہوں تو امید ہے کہ مجھ پر حد سے زیادہ نکتہ چینی کا الزام نہ لگایا جائیگا۔"

ہم مدح سرائی سے بھی متفق ہیں اور نکتہ چینی سے بھی۔ ڈاکٹر ٹائلر کی محنت کا استخفاف ناممکن ہے اور نہ السنۂ مشرقیہ کے متعلق ان کی خدمات کو سوائے کامل احترام و امتنان کے کسی اور نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی کہیں گے کہ ان کے تمام وضع کردہ الفاظ پر صاد کرنا مشکل ہے۔ بعض بعض حالتوں میں ان کا انتخاب اچھا نہیں رہا۔ مثلاً ہیڈروجن کے لئے ایک طویل عربی کلمہ مقرر کیا ہے جس کے معنی "پانی پیدا کرنے والی ہوا" ہیں۔ نیٹروجن کے لئے انھوں نے "شورہ پیدا کرنے والی ہوا"، اور آکسیجن کے لئے "تیزاب پیدا کرنے والی"، کے مترادف الفاظ وضع کئے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے عناصر کے نام یا تو حتی الامکان مختصر یا مفرد ہونے چاہئیں اور یا انھیں ویسا ہی رکھنا چاہیئے۔ ان الفاظ کا تو ذکر ہی کیا جو علم کیمیا کے متعلق ہماری جدید ترقی یافتہ معلومات کی رو سے غلط ثابت ہوئے ہیں، اسی طرح ڈاکٹر ٹائلر کی کئی منتخبہ اصطلاحات میں جو تشریح الابدان اور عضویات سے تعلق رکھتی ہیں کافی اصطلاح کی گنجایش ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ڈاکٹر ٹائلر کی محنت آیندہ مترجمین کے لئے بے حد مفید ہوگی اور انھیں اس سے بہت مدد ملے گی۔ ڈاکٹر ٹائلر کی تصنیف ان کے لئے لفظی ذخائر کا ایک وسیع خزانہ ہوگی۔ جسے ہوشیاری سے استعمال کر کے عمدہ نتائج پیدا کر سکیں گے۔

پٹنہ کے ترجموں کے نمونے اس سے بالکل متضاد ہیں۔ ڈاکٹر ٹائلر نے تو یہ غلطی کی ہے کہ بڑے بڑے اور مغلق الفاظ استعمال کئے ہیں جن کا تلفظ نہایت مشکل اور یاد رکھنا اور بھی مشکل ہے۔ لیکن رائے سوہن لال نے اپنے لغو اور سوقیانہ الفاظ سے ہمیں متحیر کر دیا ہے۔ اور اگر اپنا اہم مقصد ظاہر کرنے کے لئے وہ ان کے ساتھ ایک تمہید کا اضافہ نہ کرتے تو ہم یہی سمجھتے کہ ان تمسخر آمیز الفاظ سے اہل ہندوستان کو مادری زبان میں سائنس کی تعلیم دینے کے خیال کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ ہم

رائے سوہن لال کی علمی واقفیت اور قابلیت کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہمیں ان کی متانت پر پورا بھروسہ ہی۔ ہمارے خیال میں اُردو کے ادیب کی حیثیت سے انھوں نے اپنے لئے ایک ایسی ڈگر قایم کرلی ہی جس کے یقیناً بہت سے پیرو ہوں گے۔ ان کی تحریر کے چند نمونوں سے جو ہماری نظر سے گزرے ہیں یہ ظاہر ہی کہ اُردو نثر لکھنے میں وہ پورے قادرالکلام ہیں۔ بااین ہمہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کی ادبی ندرت نوازیاں ہرگز روا نہیں رکھی جا سکتیں۔ اور ان کی اوچھے طریقے کے بھی بہت کم حامی نکلیں گے۔ ہم خود اس بات کے بہت بڑے موئد ہیں کہ اُردو عبارت میں ہندی عنصر غالب رہنا چاہیئے۔ کیوں کہ طرز تحریر میں وضاحت زور لچک پیدا کرنے کا یہ ایک یقینی ذریعہ ہی۔ اور لکھنوی انشا پردازوں کی ایجاد کردہ ثقیل اُردو کو جس میں عربیت اور فارسیت زیادہ ہو ناپسند کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ رائے سوہن لال کی دہقانیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ اور ایسی زبان کے رواج کی مخالفت کریں جو دیہات کے گنواروں ہی کو زیب دیتی ہے۔ اور جسے ہندو مسلمان دونوں مہذب گفتگو میں کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ڈاکٹر ٹائٹلر کی پوری لغت میں اتنی خامیاں نہ ہوں گی جتنی غلطیاں اور لغویتیں رائے صاحب کی مختصر سی فہرست اصطلاحات میں ہیں۔ ہمیں اس امر کا اعتراف ہی کہ بعض الفاظ کا انھوں نے نہایت مناسب و موزوں ترجمہ کیا ہی۔ لیکن اس بات پر حیرت بھی ہے کہ حسب ذیل الفاظ کا اس قدر غلط ناموزوں سوقیانہ عامیانہ اور علمی ضرورت کے لحاظ سے محض بیکار ترجمہ کرنے کی انھوں نے کیوں کر جسارت کی ؟

Resultant	پھل
System of forces in equilibrium	ملے تلے ہوئے زور
Plane	کھیت
Exact Science	جانے ہوئے بدیا
Experimental Science	بچے ہوئے بدیا
Elementary body	نرالی چیز
Definition	پہچان
Axiom	جانی ہوئی بات

Circumfernce	گھیر چکر
Rigtangle	کھڑا کونا
Relation	لاگ۔لگاؤ
Acute Angle	سکڑا کونا
Equilateral	برابر بازو تخط

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اصطلاحیں ہیں جو اپنی لغویت پر خود شاہد ہیں۔ ہمیں تو مطلق اُمید نہیں کہ ان الفاظ کو رائے سوہن لال کے ذاتی حلقۂ اثر سے باہر بھی کوئی شخص سمجھ سکے گا۔ رائے صاحب نے جو اصطلاحات بطور نمونہ منتخب کی ہیں انھوں نے ان کے سنسکرت و عربی مترادفات بھی دو خانوں میں درج کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہی اور ہمیں وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ان کے الفاظ اُن اصطلاحوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ سنسکرت کی اصطلاحات کے متعلق تو ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے گو ہمیں اس بات کا یقین ہی کہ وہ عام طور پر صحیح ہیں لیکن عربی الفاظ کے ترجمہ میں رائے صاحب چنداں کامیاب نہیں ہوئے۔ ان میں سے بعض الفاظ کی عربی ناقص ہی اور ان کے بجائے عربی یا فارسی کی زیادہ موزوں اصطلاحیں بآسانی مقرر کی جا سکتی ہیں۔

رائے سوہن لال کی عربی سے ہمیں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ مثلث کا ترجمہ "تین بنا ہوا" اور فن مثلثات کی اصطلاح "جیب" کا ترجمہ جیب کرکے ان الفاظ کا مضحکہ اُڑانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس سے کچھ تعرض نہیں۔ لیکن علمی اصطلاحوں کے اس دوغلے ترجمہ پر جو انھوں نے کیا ہی ہم خاموش نہیں رہ سکتے ان کے الفاظ "وڑتا بجلی بل" اور "رگڑ بجلی بل" (Voltaic Electricity) اور (Friction Electricity) کے قایم مقام کبھی نہیں ہو سکتے۔

سائنس کو عام فہم کر دینا اور بات ہی اور اس کے ادب کو بالکل عامیانہ اور لغو بنا دینا بالکل دوسری چیز ہے۔ ہمارے خیال میں اُردو ہندی داں لوگ سنسکرت و عربی کے ان الفاظ کو جو رائے صاحب نے رد کر دیئے ہیں ان کے بھونڈے ترجمہ کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ اور صحت کا مقصد بھی الفاظ سے باحسن الوجوہ پورا ہوگا۔ تاہم بتقاضائے انصاف یہ ماننا پڑے گا کہ رائے سوہن لال اصطلاحات وضع کرنے میں بعض دفعہ نہایت جدت ظاہر کرتے ہیں اور ان کی علمی مضامین لکھنے کی طرز گو تصنع سے خالی نہیں اور بہت کچھ اصلاح کی بھی محتاج ہے لیکن اس نہج پر آج تک

اُردو زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ان کی تحریر اوسطاً بڑھی ہوئی ہے۔

ایک اور مترجم جن کا نام عزت اور توقیر کے ساتھ لیا جا سکتا ہے لکھنؤ کی رصدگاہ کے معمر کارکن مولوی کمال الدین ہیں۔ انھوں نے رصدگاہ کے منتظم کرنل ولکاک کی نگرانی میں تقریباً پندرہ کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے بارہ کے نام حسب ذیل ہیں :-

(۱) قوائے آلیہ۔ یہ کتاب ایک رسالہ سے ماخوذ ہے۔ جو کتب خانۂ معارف مفیدہ نے شائع کیا تھا

(۲) ہیئت

(۳) علم تحریکات آبی

(۴) علم الہوا

(۵) علم المناظر

(۶) حرارت

(۷) علم طبیعات سے لارڈ بروہام کی بحث

(۸) آلات ریاضی کا رسالہ

(۹) قوت مقناطیسی کا رسالہ

(۱۰) کیمیا کا رسالہ

(۱۱) ہیئت مؤلفہ برنکلے

(۱۲) رسالہ قوت فارالمرکز

ان کے باقی تراجم سائنس سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر ہم غلطی پر نہیں تو یہ سب کتابیں صوبجات متحدہ کی مقامی حکومت کے حوالے کر دی گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ ایک سابق ناظم سررشتۂ تعلیمات کے پاس بغرض اظہار رائے بھیجی گئیں۔ چونکہ یہ ترجمے تیس سال قبل کئے گئے تھے اس لئے سائنس کے مسائل جو ان میں درج ہیں موجودہ زمانہ کے لحاظ سے بہت پیچھے ہیں۔ اگر ہم غلطی پر نہیں ہیں تو ناظم سررشتۂ تعلیمات نے اس وجہ سے اور نیز اس خیال سے کہ ان کتابوں میں علمی مسائل نہایت اختصار سے لکھے گئے ہیں جو دوسری کتب کی عدم موجودگی میں طلبہ کے لئے مشکل اور بے لطف ثابت ہوں گے۔

ان کی دوبارہ اشاعت کی سفارش نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ناظم مذکور نے یہ رائے دی تھی کہ ان تراجم سے سائنس کی موجودہ حالت کے مطابق جدید کتابیں تیار کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ ہم ان کی قدر و قیمت کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتے کیوں کہ ان میں سے اہم ترین رسائل ہماری نظر سے نہیں گزرے۔ لیکن برنکلے کی ہیئت کا ترجمہ جو مولوی صاحب نے کیا ہے ہم نے دیکھا ہے۔ ہماری رائے میں یہ کتاب کسی قدر ترمیم کے بعد مشرقی متعلمین کے لئے بہت کارآمد بن سکتی ہے اور آیندہ اس سے مترجمین کو ہیئت کی انگریزی اصطلاحات کے عربی مترادفات تلاش کرنے میں بے حد مدد دی سکتی اس کی طرز تحریر میں وہ سب خامیاں پائی جاتی ہیں جو اچھے ترجمہ میں ہرگز نہ ہونی چاہئیں۔ یہاں اس بات کا بیان کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ سن رسیدہ مولوی صاحب کو ان کی ادبی محنت اور شاہان اودھ کے ماتحت طویل خدمات سرانجام دینے کے صلے میں گورنمنٹ نے ایک معقول وظیفہ عطا کیا ہے۔

ریاضی کے ان رسائل پر بھی جو پروفیسر رام چندر نے لکھے ہیں یہی قول صادق آتا ہے۔ انھوں نے بوشرلاٹ کی کتاب "اصول حساب الجزئیات و الکلیات" کا ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۵۰ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اب یہ کتاب نایاب ہے اور چونکہ اس قسم کی تالیفات میں دیسی متعلمین بہت کم دلچسپی لیتے ہیں اس لئے اُمید نہیں کہ اس کے دوبارہ چھپنے کی جلد نوبت آئے۔

اب ہم ترجمہ کے متعلق چند باتیں بیان کر کے یہ تحریر ختم کرتے ہیں۔ اب تک عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے (یا کیا جاتا تھا) کہ غیر زبان کا ترجمہ کرنے میں اس زبان کے الفاظ کے بجائے اپنی زبان کے الفاظ کا لکھ دینا اور اُسے عوام میں پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ جیسے کہ انگریزی عبارت کی انگریزی میں لفظ بہ لفظ تشریح کی جاتی ہے جس میں انٹرنس کے نصاب کی شرحیں لکھنے والے اور فرہنگ فروش ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اس بات کی مطلق پروا نہیں کی جاتی تھی کہ الفاظ سے مطلب واضح ہوتا ہے یا خبط۔ اُردو زبان میں ایک کتاب شائع کر دینے کے بعد مترجم یہ سمجھ لیتا تھا کہ اس کا مقصد پورا ہو گیا اور اس سے بڑھ کر وہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اس بات کا اسے کبھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اپنی کتاب کا مطلب سمجھانے کے لئے اسے خود اس کے ہر نسخہ کے ساتھ ساتھ ان تمام ناظرین کے پاس جانا چاہیئے جو اس کی زبان سے ناآشنا ہیں۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچتا تھا کہ اس کی کتاب دیوتاؤں اور دیمیوں کی ان تصویروں کے مانند ہے جو ہرزہ گرد برہمن گلی کوچوں میں مذہبی خیال کے تماشابینوں کو دکھاتے پھرتے ہیں اور ورق اُلٹتے ہوئے ان دیوتاؤں اور دیمیوں کے کارناموں کے گُن گاتے ہیں۔ رائے سوہن لال کے ترجموں کے متعلق پٹنہ کے ڈاکٹر فالن اپنی تنقید کے ابتدائی حصہ

میں کیا خوب لکھتے ہیں :-

سائنس کی کتابیں ابھی دیسی زبانوں میں بالکل مفقود ہیں اس کی کل کائنات فی الحال ابتدائی ہندسہ جبر ومقابلہ اور کسی قدر فلسفۂ طبعی ہے۔ طبعیات علم المدن اور خالص ومخلوط ریاضی کے اعلیٰ شعبوں میں تو میدان بالکل خالی پڑا ہے وہ چند تالیفات جو اس وقت تک ہو چکی ہیں ان کا بھی یہ حال ہے کہ ان میں ایسی دس کتابوں کے نام بھی مشکل سے گنائے جاسکتے ہیں جو واقعی قابل قدر ہوں۔ مغربی علوم کا ترجمہ دیسیوں کے سامنے زیادہ تر جس زبان میں پیش کیا گیا ہے وہ نامکمل، بے لطف، ترتیب و وضاحت کے لحاظ سے ناقص، اور اکثر اوقات خلافِ محاورہ وبعید الفہم ہے۔ یہ کتابیں بالعموم کم علم اصحاب اور ناتربیت یافتہ دماغ والوں نے لکھی ہیں۔ جو اپنے مضمون کے محض سطحی علم کی وجہ سے اور زبان پر پوری قدرت نہ رکھنے کے باعث اسی بات میں سہولت دیکھتے ہیں کہ اصلی عبارت کا مبہم اور لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیں۔

تاہم یہ ایک فال نیک ہے کہ لوگ اب ترجمہ کے صحیح مقصد سے آگاہ ہوتے جاتے ہیں وہ اچھے ترجمہ کی زیادہ قدر کرنے لگے ہیں۔ اور اس کی خوبیوں سے بھی بہ نسبت سابق زیادہ واقف ہوتے جاتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر فالن مترجم کا کام کچھ آسان نہیں ہے۔ سائنس کی ایک ابتدائی کتاب لکھنے کے لئے بھی اس مضمون پر پورے عبور کی ضرورت ہے تاکہ ابتدائی مسائل کو انتہائی مسائل کے مطابق واضح کیا جاسکے۔ اس عبور کے ساتھ قوتِ متخیلہ اور دوسرے لوگوں کے سامنے، حقایقِ معلومہ کو وضاحت وربط کے ساتھ بیان کرنے کی قابلیت کا ہونا بھی لازمی ہے۔ یہ امر کس قدر تکلیف دہ ہے کہ مدرسین وطلبہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ محض الفاظ پر ضائع کرتے ہیں۔ جب تک دیسی زبانوں میں مفید کتابیں اور ملک میں ایسے معلمین نہ ہوں گے جو اس کمی کو پورا کرنے کی قابلیت وآرزو رکھتے ہوں، مظاہرِ فطرت دیسی طلبہ کے لئے بے معنی و بے لطف رہیں گے۔ قوتِ ذہنی اور جذبات کے اس طرح رائگاں جانے پر ان ہمدرد اصحاب کو بہت متفکر ہونا چاہیئے جنھیں ذہنی تربیت کی قدر وقیمت اور لذّت کا تجربہ ہے۔

اصول وضع مُصطلحات علمیہ

(۱) اگرچہ لامشاحۃ فی الاصطلاح ہر قوم و ہر زبان میں مسلم ہے مگر اصل اصول وضع مصطلحات کا یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو حافظہ پر بار کم ڈالا جائے اس لئے ایسے مصطلحات وضع کرنا جن میں لفظاً موضوع لہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے بالکل نامناسب ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اُس سے احتراز کرنا چاہیئے۔

(۲) زبان عربی میں جتنے مصطلحات قدیم زمانہ سے موجود ہیں اُن کو ہرگز ترک نہ کیا جائے اُن کے عوض جدید مصطلحات وضع کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً ہیئت، ہندسہ اور اُس کے فروع حساب، جبر و مقابلہ، اُقلیدس، مخروطات وغیرہ یا طب، تشریح، منطق وغیرہ میں ہمارے اساتذۂ فنون نے جو مصطلحات قدیم زمانہ میں وضع یا دوسری کسی زبان سے اخذ کئے ہیں وہ بحالہا قایم رہیں اُن کے عوض جدید مصطلحات تلاش کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ادنیٰ توجہ سے معلوم ہو جائیگا کہ بعض فنون کے متعدد عربی مصطلحات آج یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں پھر ہم کیوں اپنے مصطلحات کو ترک کر دیں۔

(۳) جو لغات غیر زبانوں سے لے کر قدیم زمانہ میں معرب کر لئے گئے ہیں یا جو دخیل ہیں وہ اپنے حال پر قایم رہیں اصل کی طرف رجوع کرنا ضرور نہیں۔

(۴) جدید مصطلحات اُردو زبان کے لئے وضع کرنے میں جہاں تک ممکن ہو امور ذیل ملحوظ رہیں۔ حتی الامکان ہندی، فارسی، عربی، انگریزی کے اُنھیں لغات سے مدد لی جائے جو ہماری زبان اُردو میں مُروّج ہیں۔ غیر مانوس جدید لغات سے احتراز کیا جائے۔

(۵) ثقل تلفظ، رکاکت، تراکیب مغلق و غیر مانوس، توالی اضافات وغیرہ سے پرہیز کیا جائے۔ مثلاً ہٹا کٹا، چھپر کھٹ، گندھک، کھٹائی، کھونٹی ثقیل اور رکیک الفاظ ہیں۔ ان کے مترادف الفاظ تندرست و توانا، پلنگ چارپائی، کبریت، گوگرد، ترشی، حموضۃ، میخ ہماری زبان میں موجود ہیں۔

(۶) امالہ ترخیم، فک اضافۃ، اور دوسرے تصرفات سے بوقت ضرورت بے تامل کام لیا جائے۔

(۷) اسم سے فعل بنا لینا ایک قسم کا تصرف ہے جس کی بڑی ضرورت ہے اس کو جائز رکھنا چاہیئے۔

(۸) عربی اور ٹھیٹھ ہندی لفظوں کی ترکیب سے حتی الوسع پرہیز کرنا چاہیئے۔

(۹) جہاں دو یا تین یا زیادہ الفاظ کو ملا کر ایک مُرکب لفظ بنانا منظور رہو جس طرح فن کیمیا میں اکثر ضرورت پڑے گی تو اس قدر تصرف جائز رکھا جائے کہ ہر لفظ مفرد میں سے دو ایک حرف حذف کر کے مُرکب اصطلاح میں اختصار پیدا کر دیا جائے۔

(۱۰) فن کیمیا میں سیکڑوں نام بسیط اور مُرکب مادّوں کے مستعمل ہوں گے جن کے واسطے علامات کا مقرر ہونا ضرور ہے۔ یوروپین زبانوں کی کتابت میں حروف علٰحدہ علٰحدہ لکھے جاتے ہیں اس لئے یوروپین لوگوں کو اس میں کوئی دقت نہیں پیش آتی۔ اب سوال یہ ہے کہ اُردو میں مُرکب مادّوں کے ناموں میں حروف الگ الگ لکھے جائیں یا ملا کر مثلاً کبیکج اور ک ب ی ک ج پر غور کیجئے۔ حروف کے الگ الگ لکھنے میں آسانی یہ ہے کہ اُن کی مقدار کے اظہار کے لئے ہندسے لگا دیئے جا سکتے ہیں۔ ملا کر لکھے جائیں تو ہندسے لگانا مشکل ہو جائے گا گو حروف کے علٰحدہ علٰحدہ لکھے جانے میں طوالت بیشک ہے۔

قدیم یونانی علم ادب

نثر یونانی کا پہلا دور

(از مولوی سید ہاشمی صاحب رُکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ)

رُکن کی یونانی بحر جیسے ئیام بک (Iambic) یا الج یاک (Elegiac) کہتے تھے، اتنی آسان اور سادہ بحر ہی کہ اس میں ہر قسم کا مضمون بلا دقت ادا ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی زبان کے منجھنے اور صاف ہونے کے صدیوں بعد تک اس کے ادب میں نظم یا ڈراما[1] کے سوا تحریری نثر کا وجود نہ تھا۔ اوّل اوّل چھٹی صدی قبل مسیحؑ کے وسط میں بعض مذہبی یا فلسفی اشخاص نے مسجع نثر میں اپنے خیالات کا اظہار کیا بھی[2] تو نظم کے مقابلے میں یہ تحریریں مقبول نہ ہوئیں اور گو شجرہ نسب یا حالات سفر بیان کرنے میں کبھی کبھی نثر سے کام لیا جانے لگا تھا لیکن قریب قریب سو برس تک کوئی ایسی کتاب نثر یونانی میں نہیں لکھی گئی جو یادگار رہنے کے لایق مانی جائے۔ اور اس اعتبار سے یونانی زبان کا پہلا قابل ذکر مصنف ہلانی کوس کو سمجھانا چاہیئے جس نے پانچویں صدی (ق م) کے وسط میں یونان، مصر، فنیقیہ اور ایران کی تاریخیں لکھیں اور محض سیدھے سادے واقعات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ کہیں کہیں درایت سے کام لیا اور علت و معلول کی ایسی بحثیں بھی کیں جن کا تحمل نظم نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ اظہار مطالب کے لئے زبانی گفتگو کے مقابلے میں خود نثر یا تحریر ہی کم درجے کا مصنوعی آلہ ہے تو نظم کی قیود میں وہ مطالب پوری طرح کب ادا ہو سکتے ہیں۔

ہرودوتس
۴۸۴ تا ۴۲۵ ق م

لیکن یونانی زبان کا سب سے نامور قدیم مصنف ہرودوتس (ہرودت۔ ہیرودوتوس) ہے جسے دنیا کا سب سے پہلا انشا پرداز کہا جائے تو بجا ہوگا۔ وہ میلاد مسیحؑ سے ۴۸۴ برس پہلے ہالی کرنسس میں پیدا ہوا جو ایشیائے کوچک کے جنوبی ساحل کا مشہور شہر تھا۔ یہاں ایشیائی اور یونانی ملے جُلے رہتے تھے اور یہاں

---

[1] یونانی نظم اور ڈراما کی ابتدا اور ترقی کے مختصر حالات دیکھنے ہوں تو ملاحظہ ہو تاریخ یونان قدیم باب ششم۔ یہاں ہم نے اس کو نہیں دکھایا کیوں کہ یہ مضمون حقیقت میں اسی کتاب میں ضم کرنے کی غرض سے تیار کیا گیا تھا۔

[2] اس قدیم ترین نثر کا پہلا نمونہ فرکی دس کی کتاب کو مانا جاتا ہے جس میں مسائل الٰہیات کی بحثیں تھیں اور جو ۵۵۰ ق م کے قریب تصنیف ہوئی

لوریہ یہ صوبہ (کاریہ) سلطنتِ ایران میں داخل تھا۔ اس تعلق نے ہردوتس کو تمام ایرانی مقبوضات کی سیاحت کا شوق دلایا اور وہ اپنی عمر کے پہلے نصف میں سواحلِ فنیشن (یا بحر اسود) سے دریائے نیل تک اور وسط ایران سے بحرایجین کے جزائر و ممالک تک قریب قریب سب جگہ پھرا۔ گویا اُس زمانہ کی متمدن دنیا کا کوئی مشہور مقام ایسا نہ ہوگا جس کی ہرودوتس نے سیر نہ کی ہو۔

۴۴۶ھ ق م میں وہ ایتھینز (ایتھنہ) آیا جہاں اُن دنوں پری کلیس (فارقلیس) کا، یعنی ایتھینز کے عین عروج کا زمانہ تھا۔ فنونِ لطیفہ کے بڑے بڑے باکمال جمع تھے سفاکلیس کے بے نظیر ناٹکوں کی دھوم مچی ہوئی تھی غرض ایک جوہرِ قابل کی جلا کے لئے بہتر سے بہتر سامان مہیا تھا۔ ہرودوتس کئی سال تک اس پُرلطف صحبت میں رہا پھر جنوبی اطالیہ کی یونانی نوآبادی ثری میں چلا آیا اور یہیں غالباً ۴۲۵ھ ق م میں اس نے وفات پائی۔

ہرودوتس کی ضخیم تاریخ کے دو حصے اور آٹھ "مقالات" ہیں اور پہلے حصے کے پانچ مقالات میں ایرانی سلطنت کی بنا، فتوحات اور ترقی کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں اُن ملکوں کے جغرافی حالات بھی آجاتے ہیں جو ایرانی بادشاہوں نے فتح کئے تھے، واضح رہے کہ ان ایرانی بادشاہوں سے خاندان ہخامنش کے فرماں روا (یعنی کیانی) مُراد ہیں جن کا پہلا بادشاہ سیروس اوّل اور سب سے نامور فاتح سیروس دوم یا کیخسرو تھا۔ اس کا زمانۂ حکومت ۵۵۹ سے ۵۲۹ ق م تک ہے اور اس کی وفات اور ہمارے مؤرخ کی ولادت میں صرف ۴۵ برس کا فصل ہے۔ گویا ہرودوتس کو اس عہد کے حالات لکھنے میں خود شاہ کیخسرو کے معاصرین سے چشم دید واقعات سننے کا موقع حاصل تھا اور یہی وجہ ہے اس کی ایرانی تاریخ ہماری عربی فارسی تاریخوں سے زیادہ معتبر ہے کیوں کہ ان مشرقی تواریخ کے ماخذ مشتبہ ہیں اور یقینی طور پر معلوم نہیں کہ انھیں کس نے کب قلم بند کیا تھا۔ اسی بنا پر راقم الحروف کا بہت دن سے خیال ہے کہ ہرودوتس کی کتاب کا اُردو میں ترجمہ ان صاحبوں کے واسطے نہایت مفید ہوگا جنھیں شاہ نامہ فردوسی کی بدولت ایران کی قدیم تاریخ سے دلچسپی ہے اور اس کے افسانوں میں اصلی واقعات کا سُراغ لگانا چاہتے ہیں۔ سائکس کی "تاریخ ایران" بھی جسے انجمن ترقی اردو ترجمہ کرا رہی ہے ہمیں ہرودوتس کی کتاب سے بے نیاز نہیں کر سکتی کیوں کہ قدیم دنیا کے دلچسپ اور چشم دید حالات کا اتنا بڑا ذخیرہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ دوسرے ہرودوتس کو "ابوالمؤرخین" مانا جائے یا نہ مانا جائے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ صحیح معنی میں دنیا کا سب سے پہلا نثار ہے اور ہر شخص کو جسے علم ادب کی تاریخ کا ذوق ہو، اس کی نثر کا مطالعہ کرنا

ضروری ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ترجمہ میں اس کی انشا پردازی کی خصوصیات پوری طرح نہ دکھائی جا سکیں گی لیکن اس کے متین اسلوب بیان اور تحریر کی بے تکلفی اور روانی کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جائے گا اور یہی اس کی انشا پردازی کا کمال ہے۔

درایت کے فن میں اس کو چنداں دخل نہیں ملکی آئین و قوانین اور مذہب و معاشرت کی تہ میں قوم کی عقل و اخلاق کے جو راز پنہاں ہیں اُن تک اُس کی نظر نہیں جاتی سیاسی واقعات بہت پیچیدہ اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان اسباب کا انسان کے طبعی جذبات اور قوانینِ فطرت سے گہرا تعلق ہے۔ مگر ہمارا مؤرخ ان اسباب و نتائج سے مطلق بحث نہیں کرتا "تمام دنیا کی تاریخ" پڑھ کر صرف دو گر اُس کے ہاتھ آئے ہیں اور اُس کے "فلسفۂ تاریخ" کی کُل کائنات یہی ہے :-

(۱) ایک تو یہ کہ جس بادشاہ یا قوم نے غرور کیا وہ مغلوب و سرنگوں ہوئے بغیر نہ رہا اور مدبّرِ حقیقی نے ضرور اسے سزا دی (۲) اور دوسرے یہ کہ ایشیا اور یورپ میں قرن ہا ے دراز سے دشمنی چلی آتی ہے اور یوں ہی مدتوں چلی جائیگی اور (ہرودوتس کے زمانہ تک) مغرب و مشرق کی اس دائمی عداوت کا آخری مظاہرہ وہ فوج کشی تھی جو زرکسیز (زرزیر) شاہِ ایران نے یونانیوں پر کی۔ اور اس بادشاہ کی شکست و ذلت پہلے کلئے کی عبرتناک مثال ہے جسے بار بار بتانے سے ہمارا مؤرخ کبھی نہیں تھکتا۔

توسی دید ۴۷۱ تا ۴۰۰ ق م

خلاصہ یہ کہ ہرودوتس نے درایت کا حق بخوبی ادا نہیں کیا۔ البتہ آنے والوں کے واسطے واقعات وقصص کا اتنا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اُن پر غور و خوض کر کے خود بہت سے نتائج استنباط کر سکتے ہیں۔ بایں ہمہ مطالعہ کرنے والوں کا اس میں بہت نقصان ہے کہ خود وہ مصنّف جس نے واقعات کو جمع کیا بلکہ دیکھا ہے اُن کے اسباب و علل پر بالکل بحث نہ کرے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی نکتے کو سب سے اوّل ہرودوتس کے نوجوان ہم عصر توسی دی دیس (توسی دیدِش۔ توسی دِدیز یا توسی ڈائی ڈیز) نے سمجھا اور اپنی تاریخ "جنگِ پلوپی نسس" میں واقعات کو صرف بیان کر دینے پر اکتفا نہ کی بلکہ اوّل اُن کی جانچ پرتال کی اور پھر ان کی ابتدائی وجوہ کا سُراغ لگایا اور آخر میں ان سے اخلاقی اور سیاسی نتائج کا استنباط کیا۔ یہی سبب ہے کہ اگر ہرودوتس کو فنِ تاریخ نگاری کا بانی کہا جائے تو "فلسفۂ تاریخ" کا موجد توسی دی دیس کو ماننا ہوگا۔ حقیقت میں وہ پہلا شخص ہے جو تاریخ نویسی کے قواعد اور مقاصد کو سمجھا اور جس قدر واقعات کی تحقیق میں اس نے محنت کی اُسی قدر اس بات کا لحاظ رکھا کہ اُن کے بیان

کرنے میں بھی مؤرخ کے ذاتی تعصب و میلان کا دخل نہ ہونے پائے۔

اس قابل تقلید و ستایش اصول کی پابندی کرنے میں اُسے ایک آسانی حاصل تھی جس پر یورپ کے بعض نقادوں کی نظر نہیں پڑی یعنی یہ کہ وہ کسی غیر قوم کی تاریخ نہیں لکھ رہا تھا بلکہ اس کا موضوع صرف یونانیوں کی باہمی جنگ و جدال تھا۔ یہ سچ کہ اُن دنوں یونان کے شہروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں الگ بنا رکھی تھیں اور ہر شہر کے رہنے والے اپنے تئیں سب سے جداگانہ ایک خاص "قوم" تصور کرتے تھے۔ مگر قبائلِ عرب کے اختلافات کی طرح یہ نہایت حقیر و مصنوعی اختلاف تھا ورنہ نسل و مذہب اور زبان و معاشرت کے اعتبار سے وہ سب "ہلینز" یا "یونانی" کہلاتے تھے اور اگر کسی روشن خیال مؤرخ نے ان کے اندرونی اور فرعی اختلاف کو نظر انداز کر دیا تو یہ چنداں حیرت انگیز نہیں۔ دوسرے اسی جنگ پلوپنی سس کے دوران میں توسی دید کو ترکِ وطن کرنا پڑا تھا اور اُس کے آیندہ بیس برس بیشتر اپنے وطن (یعنی ایتھینز) کے دشمنوں ہی میں گزرے۔ پس اتنی مدت میں اگر اپنے شہر کی محبت یا حریف سے تعصب کا جوش کم ہو گیا ہو تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔

اس کی کتاب کے تین حصے اور آٹھ مقالات ہیں۔ آخری مقالے کو وہ ختم کرنے نہیں پایا اور اس اعتبار سے کتاب گویا ناتمام رہی۔ بایں ہمہ جنگ پلوپنی سس کی بڑی بڑی لڑائیوں کا ذکر کتاب میں موجود ہے اور مؤرخ کو بزم و رزم کے بہت سے یادگار مناظر دکھانے کا موقع حاصل ہے اور انھیں میں بعض عبرت و رنج کے واقعات لکھنے میں توسی دید نے انشا پردازی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا طرز تحریر اکثر مقامات پر پیچیدہ اور غیر مربوط ہو جاتا ہے لیکن اصلی کمال یہ ہے کہ واقعاتِ تاریخی سے فلسفیانہ نتائج اخذ کرتا ہے اور خود واقعات کو اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والوں کے سامنے اس عہد کے یونانیوں کی دماغی حالت اور دلی خیالات کا مُرقع آ جاتا ہے۔ اس غرض کے لئے مؤرخ نے "حدیثِ دیگراں" کا طریقہ اختیار کیا ہے اور مختلف اشخاص کی طرف سے فرضی تقریریں لکھی ہیں جن میں کہیں کہیں وہ قوت و شان پیدا ہو جاتی ہے کہ عصر جدید کے بعض مغربی انشا پرداز اُن کو اپنا نمونۂ تحریر بناتے ہیں۔

زِنوفن
۴۳۱ تا ۳۵۵ ق م

مگر یورپ میں ان دونوں مؤرخوں سے زیادہ قبولیت جن یونانی مصنفوں کو حاصل ہوئی وہ زِنوفن اور افلاطون ہیں۔ یہ دونوں حکیم سقراط کے شاگرد تھے اور اپنی اپنی جگہ اس کی تعلیم کو پھیلانے کی سعی کرتے رہے۔ لیکن افلاطون خود ایک مجتہد کی حیثیت رکھتا ہے اور اکثر اصول و عقائد جنھیں اس نے اپنے

اُستاد سے منسوب کر دیا ہے خود اُس کی فکرِ عالی کا نتیجہ ہیں۔ برخلاف اس کے سپاہی مزاج زِنوفن اپنے اُستاد کا عقیدتمند مقلّد ہے اور اپنی تصانیف یا عملی زندگی میں اس کی تعلیم سے مطلق تجاوز کرنا نہیں چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب تذکرہ سقراط" (Recollections of Socrates) حکیم موصوف کے اقوال و سوانح کی نہایت کارآمد یادگار ہے اور تاریخی اعتبار سے حکیم افلاطون کی تحریروں کی نسبت کچھ کم باوقعت نہیں سمجھی جاتی۔ اگرچہ بعض مقامات پر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا پرجوش مصنف اپنے اُستاد کا ٹھیک ٹھیک مطلب ہی نہیں سمجھا۔ بہرحال اسے اپنے اُستاد سے اتنی محبت تھی کہ جب اس پر مقدمہ چلایا گیا اور سزائے موت ملی (۳۹۹ق م) تو زنوفن اپنے وطن ایتھینز کو چھوڑ کر چلا گیا اور اسپارٹہ کے بادشاہ اَجسی لاوس کی ملازمت اختیار کرلی۔ اس کے بدلے میں اہلِ ایتھینز نے اس کو سرکاری طور پر جلاوطن کر دیا اور اُس کی باقی عمر دشمنانِ وطن یعنی اہلِ اسپارٹہ ہی میں بسر ہوئی۔

زنوفن کی سب سے مشہور کتاب "انا باسیس" ہے جو یورپ کے اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی تھی۔ اسے ایک سپاہی کا فوجی سفرنامہ سمجھنا چاہیئے جس میں اس نے دریائے دجلہ تک جانے اور وہاں سے واپس آنے کے حالات لکھے ہیں۔ واضح ہو کہ جب ایرانی شہزادی کا ئُروس دیا سیرس) نے اپنے بڑے بھائی اردشیر ثانی پر فوج کشی کی تو ایشیائے کوچک میں تقریباً ۱۲ ہزار یونانی سپاہی بھی فراہم کئے اور ان پر اس کو بہت بھروسہ تھا۔ لیکن بابل کے قریب موضع کُناک سا کی لڑائی میں یہ شہزادہ مارا گیا (۴۰۱ق م) اور اس کی تمام فوج نے شاہ ایران کی اطاعت قبول کرلی۔ مگر یونانی اجیر سپاہی اس امر پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے اور انھیں ایرانیوں کے علی الرغم وطن واپس آنا پڑا۔ "اس پسپائی" میں اُن کو بڑی بڑی زحمتیں پیش آئیں جن کا زنوفن نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مؤرخوں کا قول ہے کہ زنوفن کی اس کتاب نے سلطنت ایران کی اندرونی کمزوری کو اہل یونان پر منکشف کر دیا اور اس کی وجہ سے فیلقوس اور اسکندر مقدونی کو خاص ایران فتح کرنے کی جسارت ہوئی ورنہ اس سے پہلے ایران کے نام سے یونانیوں کو دہشت ہوتی تھی۔ مگر ان اثرات سے قطع نظر مصنف نے اس کتاب میں جس خوبی سے اپنے کوچ کے حالات بیان کئے ہیں وہ انشا پردازی کا بہت عمدہ نمونہ ہے اور انجمن ترقی اُردو کو جب موقع مل سکے اس قدیم نثر کا عکس دکھانے کے لئے "انا باسیس" کے ساتوں یا کم سے کم آخری چار مقالات کا اپنی زبان میں ترجمہ کرا لینا چاہیئے۔

دو اور تاریخی کتابیں بھی زنوفن کی یادگار ہیں مگر وہ چنداں باوقعت نہیں۔ البتہ اس کے رسائل یا مضامین اپنی

وضع کی پہلی چیز ہیں۔ کسی خاص عنوان پر جامع ومانع مختصر مضمون لکھنا حقیقت میں مستقل کتاب لکھنے سے کم دشوار نہیں۔ اور زنوفن پہلا شخص ہی جس نے اسپارٹہ کے نظام حکومت، شہ سواری، شکار وغیرہ مختلف عنوانوں پر اس قسم کے مضامین لکھے۔ اس لئے وہ تحریریں بجائے خود اعلیٰ درجہ کی ہوں یا نہ ہوں۔ زنوفن کا یہ فخر کچھ کم نہیں کہ "نثر کا سب سے پہلا مضمون نگار" اسی کو مانا جاتا ہی۔

افلاطون | اگر نثر یونانی کے یہ تمام نمونے، حکیم **افلاطون** کی انشا پردازی کے سامنے ہیچ ہو گئے اور بعد میں بھی یورپ نے بہت کم نثار ایسے پیدا کئے جو حسنِ بیان میں سقراط کے اس نامور شاگرد کے مدمقابل سمجھے گئے ہوں۔

افلاطون ایتھنز کے نہایت شریف النسب لوگوں میں شمار ہوتا ہی اور انتیس برس کی عمر سے حکیم سقراط کا پیرو ہو گیا تھا۔ اپنے اُستاد کے مارے جانے کے بعد کچھ عرصہ وہ مصر وسقالیہ وغیرہ کی سیاحت کرتا رہا اور پھر غالباً ۳۸۶ ق م سے اس نے اپنے گھر کے قریب ایک باغ میں درس دینا شروع کیا۔ اس باغ کا نام "اکادمی" (Academy) تھا جو افلاطون کے حلقۂ درس کی بدولت آج بھی یورپ کی ہر زبان میں "علمی مجلس" کے معنی رکھتا ہی۔

افلاطون کا تمام فلسفۂ اخلاق "نظریۂ مثال" پر مبنی ہے یعنی وہ عالم اجسام اور اس کی ہر چیز کو ایک خیالی عالم یا **عالمِ مثال** کا عکس مانتا ہی اور اگر انسان جسمانی خواہشوں کی پیروی میں منہمک نہ رہی اور تا امکان مکروہات دنیوی سے الگ ہو کر غور و فکر سے کام لے تو خیال کی رسائی اس عالمِ مثال تک ہو سکتی ہی۔ بلکہ روح انسانی خود اس عالم تک پہنچنے کی مشتاق رہتی ہے لیکن اس کا یہ قدرتی ولولہ (اِروس "جذبۂ محبت") عمدہ تعلیم و تربیت کے بغیر قایم نہیں رہتا اور اسی لئے افلاطون کے نزدیک ارباب حکومت کا سب سے مقدم فرض یہ ہی کہ اپنی رعایا کی بہترین تعلیم و تربیت کا انتظام کریں اور ہر ایسی شے کو جو اس روحانی ولولے کی بگاڑنے والی ہو، اپنی حدود حکومت سے خارج کر دیں۔ نظر برایں خود حکومت انہی اشخاص کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جن میں عالمِ مثال کی پاک و کامل اشیا تک رسائی کا شوق اوروں سے زیادہ یا بیش از بیش موجود ہو۔ اس قسم کی حکومت اور آئینِ حکومت ہیں جن کا خاکہ اُس نے اپنی مشہور کتاب "حکومتِ جمہوری (Republic) اور نوامیس" (Laws) میں کھینچا ہی۔

لیکن افلاطون کی انشا پردازی کا اصلی کمال وہ طریقِ مکالمہ ہی جسے اُس نے اظہارِ خیالات کے لئے اپنے اُستاد حکیم سقراط کی تقلید میں اختیار کیا تھا۔ سقراط زبانی سوال جواب کے ذریعے مخاطب کو آہستہ آہستہ اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش

کیا کرتا تھا اور اس قسم کی مکالمات کے بعض تحریری نمونے بھی یونانی زبان میں پہلے سے موجود تھے[1] لیکن افلاطون نے اس طرزِ تحریر میں جو لطف و دلکشی پیدا کی وہ یونانی زبان میں نہ کبھی پہلے نظر آئی تھی، نہ اس کے بعد پیدا ہوئی۔ عمدہ نظم و نثر کے علاوہ اُس وقت یونان میں ناٹک نویسی کا فن اوجِ کمال کو پہنچ گیا تھا اور وہاں کے جادو بیان خطیبوں نے اپنی تحریری تقریروں سے علمِ ادب کا ایک نیا شعبہ تیار کر دیا تھا۔ مگر حکیم افلاطون کی تحریرِ اظہارِ خیالات کی ان چاروں صورتوں کا عطر ہے۔ ان چاروں کے بہترین عناصر کا جلوہ اس میں نظر آتا ہے اور وہ خود سب سے ممتاز، انشا پردازی کا نیا نمونہ ہے۔ یونانی علمِ ادب کے مشہور نقاد پروفیسر جیب اس کی طرزِ تحریر کے متعلق لکھتے ہیں کہ "وہ نظم و نثر کے بین بین حسنِ بیان اور شستگی کا مکمل نمونہ ہے اسی کے ساتھ اُس کی تحریر میں کہیں کہیں وہ رفعت و بلند خیالی آجاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے لکھنے والا حقیقت میں کسی دوسرے عالم پر نظر جمائے ہوئے ہے اور وہاں کے عجیب مناظر کا حال سُنا رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ذاتِ واجب الوجود کی نسبت جو کچھ افلاطون نے لکھا ہے خدا کا اس سے بہتر و لطیف تر تصور کسی بُت پرست کی تحریر میں نہیں مل سکتا۔ ۔ ۔"

افلاطون کے مکالمات کی کُل تعداد ۴۲ ہے مگر ان میں سے تحقیق طور پر صرف ۲۴، ۲۵ خود اُس کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں بھی سب سے اچھے رسالے وہ ہیں جو اس نے عمر کے آخری حصے میں تصنیف کئے تھے جیسے "حکومت جمہوری"، "نوامیس"، "تی میوس"، "کِرِی تیاس"، جن میں بعد کا فلسفہ اور اُس کے وہ استقرائی نتائج درج ہیں جو پہلے رسالوں میں نہیں تھے یا مبہم تھے۔ افلاطون کی انشا پردازی کی جان یہی رسالے ہیں، انھیں میں اس کی قوتِ مناظرہ قدرتِ کلام اور شاعرانہ بلند خیالی کے جلوے نظر آتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ ان تحریروں میں کہیں بھی وہ سلاست و سادگی اور متانتِ بیان کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ افسوس ہے کہ ہماری زبان میں یورپ کے اس بے مثل نثار کی کسی کتاب کا عمدہ ترجمہ موجود نہیں[2]۔ مشنری لوگوں نے یا پنجاب کے بعض حضرات نے کسی کسی کتاب کا ترجمہ کیا بھی ہے تو وہ بہت ناقص ہے اور اس لئے مقبول نہ ہوا۔ حالاں کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو زبان کا کوئی نثار جو صحیح معنی میں شاعرانہ طبیعت رکھتا ہو ایک عرصہ تک افلاطون کی تصنیفات کا مطالعہ کرکے انھیں نہایت سلیس اُردو میں ترجمہ کرے۔ سب مکالمات کا ترجمہ نہ ہو سکے تو آخری زمانہ کے مشہور مکالمات ہی کا ترجمہ کافی ہے جن پر جا بجا حاشیہ لکھ کر انھیں بالکل عام فہم اور دلچسپ بنایا جا سکتا

---

[1] افلاطون سے کچھ عرصہ پہلے خود اس کے اُستاد بھائی (الکٹ سامنوس) نے اور نیز بعض اور فلسفیوں نے اس قسم کے مکالمات لکھے تھے مگر وہ مشہور و مقبول نہ ہوئے۔

[2] افلاطون کی ۔ ری پبلک (جمہوریہ) کا ترجمہ انجمن ترقی اُردو کرا رہی ہے (اڈیٹر)

ہوتاکہ اُردو نثر پر آیندہ اس تحریر کا اثر پڑے۔ باقی افلاطون کے تمام فلسفے کو اُردو میں منتقل کرنا اور اس کی ابتدا اور بعد کے تغیرات پر تاریخی نظر ڈالنا تو ایک عمر کا کام ہے اور اس کے واسطے جس قابلیت اور فراغت کی ضرورت ہے وہ بھی ہمارے ملک میں میسر آنی دشوار ہے۔

ارسطو — اسے افلاطون کی خوش نصیبی کہئے کہ وہ جیسے نامور اُستاد کا شاگرد تھا ویسے ہی نامور شاگرد کا اُستاد بھی ہے۔ **ارسطو** اس کے شہر کا رہنے والا نہ تھا۔ لیکن سترہ برس کی عمر سے ایتھنز بھیجا گیا اور افلاطون کی وفات تک اس کے مدرسے میں داخل رہا۔ افلاطون اُسے اپنے مدرسہ کی "روح" کہا کرتا تھا لیکن افلاطون کی وفات کے بعد اُس کا بھتیجا اکادمی کا صدر معلم مقرر ہوا اور حکیم ارسطو پانچ سال اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد مقدونیہ چلا آیا جہاں شاہ **فیلقوس** (فلپ) نے اپنے ہونہار لڑکے **سکندر** (اعظم) کی تعلیم و تربیت اس کے سپرد کی (۳۴۲ قم) جب سکندر تخت نشین ہوا تو ارسطو پھر یونان کے علمی مرکز ایتھنز میں آگیا اور مرتے دم تک یہیں درس و تصنیف میں مشغول رہا۔ اُس کا مدرسہ "لی سیئم" میں تھا اور وہاں مشی کے واسطے غلام گردشیں بنی ہوئی تھیں۔ مشی کی ایسی جگہ کو یونانی میں "پری پتوی" کہتے تھے اور اسی مناسبت سے مدرسہ کا نام "پری پٹ ٹیک" یعنی "مدرسہ مشائیں" مشہور ہوگیا۔

ہمیں یہاں ارسطو کے فلسفے سے بحث کرنی نہیں ہے بلکہ یہ بات بتانی ہے کہ یونانی علم ادب کا پہلا دَور اُس پر ختم ہوتا ہے اور وہی دوسرے دَور کا آغاز کرنے والا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نثر یونانی کو نظم اور شاعری کے اثر سے قطعاً آزاد کرنے والا اور تحریری زبان میں غیر معمولی وسعت اور علمی شان پیدا کرنے والا وہی ہے۔ بے شبہ اُس کے اُستاد کے مکالمات میں ہر قسم کی علمی بحثیں موجود ہیں لیکن خاص کوئی علم ان کا موضوع نہیں۔ بلکہ وہ محض عام اخلاقی اصول اور فلسفیانہ کلیات کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ برخلاف اس کے ارسطو نے جو کچھ لکھا وہ خالص علمی تصانیف ہیں اور مختلف علوم ان کا موضوع ہیں۔ درحقیقت اس نے اپنے زمانہ تک کی تمام علمی تحقیقات کو جمع کیا ہے اور اُن کی تین بڑی بڑی قسمیں کر دی ہیں۔ منطق[۱]۔ اخلاق[۲] (Ethics) اور سیاست[۳] مدن (Politics) اور ان میں منطق یعنی "علم بحث و استدلال" کی ایجاد و تدوین کا فخر اس کو حاصل ہے۔

ایسے شخص کی تحریر میں جس کا ادبی نصب العین اتنا بلند و وسیع ہو، جس قدر جامعیت پائی جائے کم ہے۔ دوسرے ارسطو غیر معمولی دماغ کا شخص تھا اور ایسے حکیمانہ دماغ کا نتیجۂ فکر بھی نہایت عمیق و غامض ہوگا۔ کیوں کہ وہ جس مسئلے پر بحث

کرتا ہے اس کے ہر ممکن پہلو تک اس کی نظر گھس جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ارسطو کی تحریر نہایت دقیق و پُرمعنی ہوتی ہے اور سطحی دماغ کا شخص اس کے مطالب کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمارے لئے اُس کی تصانیف میں ایک نہایت مفید سبق مضمر ہے اور وہ یہ کہ زبان انسان کے قوائے دماغی کے تابع ہوتی ہے اور ہر قسم کے مضامین کے واسطے جو دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، الفاظ کے نئے معنی اور نیا پیرایۂ بیان نکل آتا ہے۔ بشرطیکہ مضمون یا خیال صاف طور پر ذہن میں آگیا ہو بعض اہل فکر نے لکھا ہے کہ دماغ میں کوئی خیال ہی نہیں آسکتا جب تک اس کے لئے دماغ اور زبان میں پہلے سے لفظ موجود نہ ہوں۔ لیکن یہ نظریہ عوام الناس کے لئے صحیح مانا جاسکتا ہے ورنہ جو اہل علم نئے انکشافات و مشاہدات کرتے ہیں، یا عالم خیال کی پہلی سرحدوں سے آگے نکل جانے کی قوت رکھتے ہیں وہ کسی طرح اس کلیے کے ماتحت نہیں آسکتے۔

القصہ حکیم ارسطو ہی وہ شخص ہے جس نے "علمی نثر" کی بنیاد رکھی اور خاص خاص الفاظ کے معنی معین کئے۔ چنانچہ بہت سی علمی اصطلاحات آج تک عربی اور مغربی زبانوں میں اسی یونانی معلم کی یادگار موجود ہیں، اور گو اس کی تصانیف عرصہ تک اپنی قوم و ملک میں شہرت نہ پاسکیں لیکن اس کے شاگردوں نے ان سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور یونانی زبان میں خالص علمی تصانیف کا ایک نیا میدان کھل گیا۔ (باقی آیندہ)۔

مقدمۂ نکات الشعرا

جنابِ مولوی از جناب مولوی سید ... صاحب مترجم تپولین اعظم وغیرہ کا عالی
از جناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی

بزمِ سخن میں میر صاحب کی میرِ مجلسی مسلّم ہے۔ ع

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اُن کے بہتّر نشتر اب تک ہزاروں دلوں میں چبھ رہے ہیں۔ ع

سامانِ صد ہزار نمکدان کئے ہوئے

لیکن بہت ہی کم نگاہیں ہیں جنھوں نے میر صاحب کی انشا پردازی یا وقائع نگاری کا کوئی نمونہ دیکھا ہوگا۔
انجمن ترقی اردو کے ہم کو ممنون ہونا چاہیے کہ اُس کی کوشش سے میر تقی صاحب میر اکبر آبادی کا تذکرہ نکات الشعرا
شائع ہوتا ہے۔ عام طور پر ابتداءً اس تذکرہ کا علم تذکرہ "آبحیات" کے ذریعہ سے ہوا تھا۔ مگر نکات الشعرا کا جو چہرہ آبحیات میں
نظر آتا ہے وہ اُن خط و خال کے بالکل برعکس ہے جو اب ہمارے سامنے ہیں۔ اس کی بحث آگے ملاحظہ ہوگی۔
نکات الشعرا چھوٹی تقطیع کے ۱۸۰ صفحوں کا ایک مختصر سا رسالہ ہے۔ مگر چوں کہ ایک اُستادِ فن کی تصنیف ہے، اس لئے
ادبی، تاریخی اور معاشرتی معلومات اور فوائد سے مالا مال ہے۔ اس میں ایک سو دو شعرا کا تذکرہ ہے جن میں بتیس دکنی و گجراتی
ہیں۔ میر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ اب تک شعرائے ریختہ کا کوئی تذکرہ نہیں لکھا گیا۔ اس بیان کے مطابق نکات الشعرا
اردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔ اُس زمانہ کے رواج کے مطابق یہ تذکرہ بھی زبانِ فارسی میں لکھا گیا ہے۔ اُس کا عہدِ تصنیف احمد شاہ
بادشاہِ دہلی کا زمانہ ہے۔ میر صاحب کے عہدِ شباب کی تالیف ہے جب کہ وہ دہلی میں تازہ وارد تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ "مؤلفِ
این نسخہ متوطن اکبر آباد است بسبب گردشِ لیل و نہار از چندے در شاہجہان آباد است"۔ اندازِ بیان کہہ رہا ہے کہ وطن کی
یاد بھولی نہ تھی۔

مؤلفِ تذکرہ | اس تذکرے کی مدد سے میر صاحب کے جن حالات اور اوصاف پر روشنی پڑتی ہے اوّل اُن کا لکھنا خالی از دلچسپی

نہ ہوگا۔ میر صاحب آگرہ کے باشندے تھے اور خان آرزو کے تربیت یافتہ شاگرد۔ چنانچہ ایک موقعہ پر اُن کی نسبت لکھتے ہیں "اُستاد و پیر مرشد بندہ است" تحصیلِ علمی کا حال واضح نہیں ہوتا۔ مگر "تذکرہ" شاہد ہے کہ فارسی میں استعدادِ کامل تھی اور اُستاد کی تربیت کا پُورا فیض حاصل کیا تھا۔ بعض جگہ عربی کے فقرے بھی استعمال کئے ہیں مثلاً "طابق النعل بالنعل"۔ آگرہ سے دلّی آئے اور خواجہ میر درؔد قدس سرہٗ اور اُن کے والد ماجد خواجہ ناصر صاحب عندلیب کے یہاں آنے جانے لگے۔ اُن کے یہاں اُردو مشاعرہ ہر مہینہ کی پندرھویں تاریخ کو ہوا کرتا تھا۔ میر صاحب اُس میں بھی شریک ہونے لگے خواجہ صاحب انداز طبیعت دیکھکر فرماتے "میر محمد تقی۔ تو میر مجلس خواہی شد" میر صاحب کا عقیدہ ہے کہ اُن کا کلام عن دعائے "درد" کے اثر کا منت کش ہے۔ اتفاقاتِ زمانہ سے مشاعرہ کا سلسلہ خواجہ صاحب کے یہاں درہم برہم ہوگیا تو اُنھوں نے میر صاحب سے فرمایا کہ اپنے یہاں مشاعرہ کیا کرو۔ چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں ہر مہینہ کی پندرھویں تاریخ کو میر صاحب کے مکان پر مشاعرہ ہونے لگا۔ خواجہ صاحب بھی شرکت فرماتے۔ میر صاحب خواجہ صاحب کے حال میں لکھتے ہیں "مجلسِ ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر ست واللہ بذاتِ ہمیں بزرگ ست" میر صاحب ایک مرتبہ سرہند بھی گئے تھے۔ اور وہاں انعام اللہ یقین کے دادا سے ملے تھے۔ اُن کے اخلاق و تواضع کی تعریف لکھی ہے۔

میر صاحب کے اوصاف | نکات الشعرا کو غور سے پڑھنے کے بعد پُورا یقین ہو جاتا ہے کہ میر صاحب نہایت پاک مشرب مؤدب و مہذب۔ زندہ دل۔ یار باش۔ انصاف پسند اور منکسر المزاج انسان تھے۔ دوستی کے مراتب اُن کے دستور العمل میں بہت وضاحت اور صفائی سے درج تھے۔ ہر موقع پر اس کی تصریح لازم ہے۔ بے تحقیق کسی بات کا لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بیان ہائے ذیل پر غور کریں صفاتِ بالا عیاں ہونگے۔

پاک مشربی | خواجہ میر ناصر صاحب عندلیب کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے "حضرت خواجہ ناصر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کہ مقتدائے عالم ست" خواجہ میر درد صاحب کی نسبت ان سے بھی زیادہ پاک الفاظ استعمال کئے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو "ایامے کہ فقیر بخدمتِ آں بزرگ وار شرف اندوزمے شد از زبان مبارکش فرمود 'میر تقی میر۔ تو میر مجلس خواہی شد'۔ الحمد للہ والمنۃ کہ حرف آں سرِ سلسلۂ خدا پرستان مؤثر اُفتاد۔ باطن آں حضرت قبلۂ اہلِ عرفاں کہ از ظاہر طاہر تر ست زود کار کرد۔ مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر ست واللہ بذات ہمیں بزرگ ست"۔ حضرت میرزا مظہر قدس سرہٗ کی نسبت لکھا ہے "مردلیست مقدس۔ مطہر۔ درویش۔ عالم۔ صاحب کمال۔ شہرۂ عالم۔ بے نظیر۔ معزز۔ مکرم..... اکثر اوقات

دریا والی صرف میکند۔ خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نگنجد۔" چند نمونے اور ملاحظہ کیجئے (میاں شرف الدین کے حال میں) "از اَحفادِ حضرت شیخ فرید شکر گنج بود۔ نور اللہ مرقدہٗ" (شاہ مبارک آبروؔ کے حال میں) "نبیرہ حضرت غوث گوالیاری است نور اللہ مرقدہٗ" "در عرس سید حسن رسول نُما صاحب قدس سرہٗ العزیز" "حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ" "حضرت حافظ۔ قدس سرہ العزیز"

ادب و تہذیب | معاصرین کا ذکر عموماً ادب اور محبت سے کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو میرزا سوداؔ "جوانیست خوش خلق و خوش خو گرمجوش۔ یار باش شگفتہ روئے۔۔۔۔۔۔ غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب میگوید۔ سر آمد شعرائے ہندی اوست بسیار خوش گوست۔ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید۔ اکثر اتفاق طرح غزل باہم می افتد۔ غرض از مغتنمات روزگار ست" سجادؔ اکبرآبادی "بسیار آدمی خوبیست۔ سخن او بپایہ اُستادی رسیدہ۔ ہر بیت خفیفش بر جگر نشتر زدہ" کرم اللہ خاں دردؔ "بسیار خوش فکر و عاشقِ سخن۔ خالی از دردمندی نیست۔ خوب میگوید و خوب می فہمد۔۔۔۔۔۔ مرد خوش ست نزاش زندہ دارد" میر حسنؔ "جوان اہلیت نوکر پیشہ۔ اکثر در بندہ خانہ بہ تقریب مجلس تشریف می آرد۔ وضع مرد آدمیانہ دارد" شاگردوں کو اس طرح یاد کیا ہے "میر عبدالرسول نثار از یاران فقیر مؤلف ست۔ چنانچہ شعر بمشورت من میسگوید" سید نجیب۔ جوان سعادت مند" "محمد محسن (میر صاحب ۔۔۔۔۔ کے بھتیجے بھی ہیں) "مصرعہ ریختہ بمشورتِ من موزوں میکند۔ خوب خواہد گفت۔ انشا اللہ تعالیٰ" کسی جگہ شاگرد کو شاگرد نہیں لکھا بلکہ ہر جگہ دوست ہی لکھا ہے۔ بعض ایسے شعرا کا بھی ذکر ہے جو پہلے ان کے شاگرد تھے پھر دوسرے اُستادوں کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ یہ برہمی کی ایک خاص صورت ہے۔ مگر میر صاحب اس پر بھی بد دماغ نہیں ہوتے نہ شکوہ کرتے ہیں۔ دیکھو بندرابن راقمؔ کا ذکر فرماتے ہیں "از شاہجہاں آباد ست۔ مشقِ سخن میرزا رفیع میکند۔ قبل ازیں با فقیر نیز مشورت شعر میکرد" اس کے بعد راقمؔ کے بہت سے اشعار انتخاب کئے ہیں۔

تحقیق | نکات الشعرا اگرچہ ایک شعرا کا تذکرہ ہے کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے۔ تاہم میر صاحب نے یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ تحقیق نہ ہوا اُس کو نہ لکھیں یا (اگر کسی وجہ سے لکھیں تو) اُس کا غیر محقق ہونا ظاہر کر دیں۔ جن شعرا کا حال معلوم نہ تھا وہاں صاف لکھ دیا ہے کہ اُن کا حال ہم کو معلوم نہیں۔ ولیؔ دکنی کی بابت لکھا ہے "واحوالش کما ینبغی معلومِ من نیست" دردمندؔ کے حال میں لکھتے ہیں "ہر چند کہ یک ملاقات با او کردہ ام لیکن خوب از احوالش مطلع نیستم" میرزا بیدلؔ

عظیم آبادی کے ذکر میں لکھا ہے۔ "ریختہ بنام او شنیدہ می شود شاید بہ تقریبے گفتہ باشد"۔ اسی طرح مرزا معز فطرت کے اُردو شعر کی نسبت لکھتے ہیں۔ "ہمچو مسموع ست کہ ایں شعر ریختہ شاعر مرقوم گشتہ۔ واللہ اعلم"۔ اسی کے ساتھ امیر خسرو کے کلام ریختہ کی بابتہ فرماتے ہیں "اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار وارد۔ دریں خود تردد ے نیست"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر صاحب کے زمانہ تک امیر خسرو کا کلام ریختہ بہت ملتا تھا۔ افسوس ہے کہ اس زمانہ میں باوجود تلاش نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب مرحوم اُس کے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

انکسارِ مزاج | تمام تذکرہ میں ایک لفظ بھی میر صاحب کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے اُن کی خود بینی و خود پسندی یا بد دماغی اور تعلی عیاں ہو۔ برخلاف اس کے اپنا ذکر ہر جگہ منکسرانہ لہجے میں کیا ہے۔ اپنے آپ کو "بندہ۔ فقیر۔ احقر۔ عاجز ترین خلایق ہیچمدان" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ اپنا ذکر جہاں لکھا ہے یوں لکھا ہے۔ "فقیر حقیر میر محمد تقی میرؔ مؤلف ایں نسخہ متوطن اکبرآباد ست"۔ اپنے تذکرہ کو مزخرفات کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ بسملؔ کے حال میں کہتے ہیں۔ "پیشتر از نوشتن ایں مزخرفات آوازۂ او شنیدہ بودم"۔ دوسروں کا ذکر جس تہذیب وادب سے کیا ہے اُس کو آپ دیکھ چکے۔ اس انکسار اور ادب کی کیفیت دیکھکر ایک خاص اثر دل پر میر صاحب کے اوصاف کا پڑتا ہے۔

میر صاحب کے اعتراض کا انداز بھی دیکھ لو۔ شیخ حاتم کا ایک مصرع ہے۔ ع

یاد کر سبز رُویاں کو وہ اب پیتا ہے بھنگ

میر صاحب اس کی نسبت لکھتے ہیں۔ "در لفظ سبز رُویاں تامل کردن ضرورست زیرا کہ آشنائے گوش ایں ہیچمدان نیست"

بے لاگ رائیں اور انصاف | باوجود اس تہذیب اور انکسار کے جہاں بلحاظ وقائع نگاری ردّ و قدح ضروری تھی وہاں بے لاگ رائے ظاہر کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دونوں کے نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ خاکسار کے حال میں لکھا ہے۔ "شعر ریختہ میگوید وخود را دُور میکشد ولیا رسفلگی میکند بلکہ از تنگ آبی بنائے ریختہ را آب رسانیدہ"۔ ثاقبؔ کی نسبت۔ "در ہمہ چیز دست دارد وہیچ نمی داند"۔ شیخ حاتم کی نسبت۔ "مردیست جاہل ومتمکن ومقطع وضع دیرآشنا۔ غنا ندارد۔ دریافتہ می شود کہ ایں رگ کہن بسبب شاعریست کہ ہمچو من دیگرے نیست یا وضع او ہمیں ست۔ خوب ست مارا باینہا چہ کار۔ شعر بسیار دارد"۔ انعام اللہ یقینؔ کے متعلق۔ "القصہ پر دو پوچ چندے کہ بافتہ است کہ ما دشمنا نیز توانیم بافت ایں قدر برخود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیش او پشت دست برزمیں میگذارد۔ بعد ملاقات ایں قدر خود معلوم شد کہ ذائقۂ

شعر فہمی مطلق ندارد"۔ اب انصاف ملاحظہ ہو۔ انھیں یقین کی بابتہ لکھتے ہیں کہ "دربزرگ زادگی و شرافت میاں یقین سخنے نیست"۔ میر عبدالحی تاباں کی نسبت "ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام ست۔ اما بسیار رنگیں یگفت"۔ میر علی نقی کی بابتہ "در ایام گزشتہ دو سہ ماہ خانۂ خود مجلس ریختہ مقرر کردہ بود آخر از وضع اُو باشانۂ او برہم خورد دربزرگ زادگی او شبہ نیست۔ بافقیر رابطۂ دلی دارد"۔ مذکورۂ بالا رایوں پر غور کرو عیب و صواب بلا کم و کاست لکھ دیئے ہیں۔ عیب پر اعتراض ہے تو خوبی کا اعتراف۔ دلی دوستی بے لاگ رائے ظاہر کرنے سے مانع نہیں۔ اُو باشانہ وضع۔ بزرگ زادگی۔ ربط دلی۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر قایم ہے۔

کمال انصاف | میر سجاد کے ساتھ تعلقاتِ ذاتی تو یہ تھے کہ گو پہلے ملاقات تھی۔ مگر پھر نوبت یہ پہنچی کہ طرفین کی کشش سے ایک گونہ ربط رہ گیا۔ صاف یوں سمجھو کہ بگاڑ ہوگیا۔ وضعداری رہ گئی۔ باوجود اس کے دیکھو میر تقی کے پایہ کا شاعر سجاد کے ایک شعر پر بیخود ہے۔ ان ہی سجاد کے ایک شعر کی داد میر صاحب کے قلم سے اس جوشِ قدردانی کے ساتھ نکلی ہے شعر یہ ہے

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے　　　جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

داد ملاحظہ ہو" ہمہ شعر سبحان اللہ۔ لیکن فقیر را از دیدنِ ایں شعر تواجد دست می دہد۔ از بسکہ از خواندنِ ایں شعر حظے برمیدارم میخواہم کہ بصد جا بنویسم"۔ میزانِ عدل کے دونوں پلّوں کو یوں مساوی رکھنا جناب میر صاحب ہی کا حصہ ہے

آفریں بردست و بر بازوئے تو

یہ "بے تہذیبی" کا زمانہ تھا۔ آج "تہذیب" کے زمانہ میں رائے کا جو عالم ہے اُس پر بھی ایک نگاہ ڈال کر مقابلہ کر لیجئے شاید نتیجہ مفید نکلے۔

دوستی کے مراتب | ہم میر صاحب ہی کے الفاظ ایک ترتیب کے ساتھ لکھے دیتے ہیں۔ دوستی کے مراتب اور اُن کا لحاظ خود بخود عیاں ہو جائے گا اور آپ کہہ اُٹھیں گے کہ عیاں را چہ بیاں (دردمند) "ہر چند کہ یک ملاقات باو کردہ ام" (ناجی) "با او یک دو ملاقات کردہ ام" (شاغل) "پیش بندہ ہم دو سہ مرتبہ آمدہ" (پیام) "بندہ اکثر ملاقات کردم" (شیخ محمد قایم) "با من ہم آشنائے بیگانہ است" (یقین) "با بندہ ہم آشنائی سرسری دارد" (میر علی نقی) "با فقیر ربطے دلی دارد" (ٹیک چند بہار) "با فقیر ہم آشنا است" (کلیم) "یک اخلاصِ تہِ دلی دارم و اکثر بحالِ ایں ہیچمداں شفقت میفرماید" (میر عبدالحی تاباں) "با فقیر یک صفائے درست داشت۔ از چندے بسبب کم اختلاطی ایں ہیچمداں کدورتے بمیاں آمدہ بود جلسش

ہلت نداد کہ تلافیش کردہ آید" (میاں سعادت علی) "با بندہ ربط بسیار داشت" (میاں حسن علی) "بندہ را بخدمت او ربط کلیست اکثر اتفاق ملاقات می افتد" (غریب) "یادش بخیر یک آشنائے بامزہ داشتم۔ بسیار خوش ظاہر بود" (سلام) "فقیر را با او از تہِ دل اخلاص ست چنانچہ اکثر اوقات باہم فکر شعر کردن و گپ زدن و مزاح نمودن می افتد۔ جوانے خوب ست۔ خدا زندہ دارد"

سلام سے یہ اخلاصِ دلی کیوں تھا۔ اس لئے کہ سلام کے اوصاف یہ تھے "چوں یار باشے و مخاطبِ صحیح حقیقت جمعیت لیاقت شخصیت آدمیت حرمت عظمت ہمہ دارد" دیکھو اس مرتبہ کو صرف یہی ایک خوش قسمت فرد پہنچ سکا وہ بھی مجموعہ صفات بنکر۔ ذرا آج کل کے "میرے دوست" اور "دلی دوست" اور "پرانے دوست" کے الفاظ و معانی پر بھی غور کر لیجئے۔

اصلاحیں | میر صاحب نے جابجا شعرا کے کلام کی نسبت لکھا ہی کہ اس شعر میں بجائے فلاں لفظ کے یہ لفظ ہوتا تو خوب ہوتا ان اصلاحوں سے میر صاحب کے مذاقِ صحیح اور مرتبہ اُستادی کا پتا لگتا ہی۔ میر سجاد کا ایک شعر ہی۔

کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یاں کوئی مَرجا ستم سے اُن کے تو کہتے ہیں حق ہوا

میر صاحب نے لکھا ہی کہ کافر کی جگہ باطل ہوتا تو اچھا تھا۔ حق و باطل کے مقابلہ نے شعر میں جان ڈال دی۔ ٹیک چند بہار کا ایک شعر ہی۔

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس یہ عجب منظر ہی جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

میر صاحب فرماتے ہیں اگر دوسرا مصرع یوں ہوتا تو خوب ہوتا ع

حسن کیا منظر ہی جس کے مبتلا ہیں مَرد و زن

ذوقِ سلیم محسوس کرے گا کہ اب مصرعہ کس قدر زوردار اور چست ہو گیا۔ آبرو

نہیں تارے بھری ہیں شک کے نقط اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

میر صاحب نے دوسرا مصرعہ یوں بدل دیا ہی۔ ع

کس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

سُبحان اللہ۔ ایک مُد نے مصرعہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ میر صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔ "اگر بجائے اُس قدر، کس قدر کیفیت شعر بہ آسماں میرسید" میر سجاد۔

کس طرح کوہکن پہ گزرینگی ہجر کی یہ پہاڑسی راتیں

میرصاحب کی اصلاح۔

ہجر شیریں میں کیونکہ کاٹے گا کوہکن یہ پہاڑسی راتیں

اسی طرح بلیغ و اُستادانہ اصلاحوں کی طرف جا بجا اشارے کئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک اصلاح خانِ آرزو کی بھی سن لو۔ میاں شرف الدین مضمون کا شعر تھا۔

مضموں تو شکر کر کہ ترا نام سُن رقیب غصہ سے بھوت ہوگیا لیکن جلا تو ہے

خانِ آرزو نے "نام" کی جگہ "اسم" بنا دیا۔ میرصاحب فرماتے ہیں۔ "وہ چہ اصلاح۔ زیرا کہ اہلِ دعوت اُسم میخوانند نہ "نام"۔"

اتفاقی اصلاح | مضمون کے حال میں لکھتے ہیں۔ "میں اُن کے اشعار انتخاب کر رہا تھا۔ کلیم میرے پاس بیٹھے تھے میں نے مضمون کا یہ شعر

میرے پیغام کو تو اے قاصد کہو سب سے اُسے جدا کرکے

اس طرح پڑھا

میرا پیغام وصل اے قاصد کہو سب سے اُسے جدا کرکے

دیکھو شانِ اُستادی شعر غلط پڑھا تو بہتر ہوگیا۔ میرے خیال میں دوسرا مصرعہ بجائے کہو کے کہنا یا کہیو ملنگ رہا ہے

طرزِ تحریر | میرصاحب فارسی با محاورہ لکھتے ہیں اکثر جگہ پُر لطف الفاظ قلم سے نکل جاتے ہیں۔ مثلاً خانِ آرزو کی نسبت لکھا ہے "چراغ دودمانِ صفائے گفتگو کہ چراغش روشن باد سراج الدین علی خان آرزو"۔ خاکسار شاعر کے حال میں "بلکہ از تُنک آبی بنائے ریختہ بآب رسانیدہ"۔ خاکسار کے لئے "تنک آبی اور "بآب رسانیدہ" کس قدر موزوں ہے۔ رُسوا ایک شاعر تھا جو اکثر عریاں رہتا تھا۔ اسی حال میں مرگیا۔ میرصاحب لکھتے ہیں "آخر در ہماں عریانی جامہ گزاشت"۔ "جامہ گزاشتن محاورہ ہے مرنے کے معنی میں۔ ٹیک چند بہار کے ذکر میں لکھا ہے "از لفظ لفظش ہزار ہزار رنگِ معنی گل میکند"۔ اربابِ ذوق اس موقع پر "گل میکند" کے محاورہ کی داد دیں گے۔ بیان۔ مبالغہ اور بیجا لفاظی سے پاک ہے۔ جا بجا اُستادانہ اشارے کرتے جاتے ہیں۔ فائدے لکھتے جاتے ہیں۔

دیباچہ میں ریختہ کی تعریف کی ہے "ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اُردوئے مُعلّائے شاہجہاں آباد دہلی"
خاتمہ میں ریختہ کی حسب ذیل چھ قسمیں لکھی ہیں۔ اوّل قسم ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی۔ دوسری قسم آدھا مصرع
فارسی آدھا ہندی۔ تیسری قسم فارسی کے حرف اور فعل استعمال کئے جائیں یہ قبیح ہے۔ چوتھی قسم فارسی ترکیبیں استعمال
کی جائیں۔ ریختہ کے مناسب حال ترکیبیں مستعمل ہوں تو مضائقہ نہیں۔ مگر اس کے لئے سلیقہ شاعرانہ درکار ہے۔ یہ میرا
مسلک ہے۔ پانچویں قسم ایہام۔ شعرائے سلف میں رائج تھا اب متروک ہے۔ چھٹی قسم وہ طرز ہے جو ہم (اہلِ عصر) نے اختیار
کی ہے۔ اس میں جملہ صفتیں ہیں۔ تجنیس۔ ترصیع۔ تشبیہ۔ صفائے گفتگو۔ فصاحت و بلاغت۔ ادابندی و خیال وغیرہ سب
اس کے ضمن میں آجاتی ہیں۔ میری بھی یہی طرز ہے۔ اس فن میں جو صاحبان طرز خاص ہیں وہ اس نکتہ کو سمجھتے ہیں۔ یہ فائدہ
اپنے دوستوں کے لئے میں نے لکھدیا ہے ورنہ میدانِ سخن بہت وسیع ہے۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست

اکبرآباد اور اُردو | دہلی و لکھنؤ کی ہنگامہ آرائیوں میں اگرچہ آگرہ گرہ در گلو ہے مگر اس کی بے زبانی صاف کہہ رہی ہے کہ تیسرے
دَور تک جو بلاکشانِ محبت بزم سخن میں آئے اُن میں سے اکثر کے دماغ اُسی کے بادۂ کہن سے پُرکیف تھے۔ شاہ مبارک
آبرو۔ شیخ شرف الدین مضمون۔ سراج الدین علی خاں آرزو۔ حضرت میرزا مظہر قدس سرہٗ۔ میر تقی میر کی ذات پر اوّل
اکبرآباد کو ناز ہے اُس کے بعد دلی یا لکھنؤ کو۔ جب مرزا غالب بھی بزم آرا ہو جائیں تو پھر آنکھ ملانا آسان نہیں رہتا۔ نکات الشعرا
میں حسب ذیل اکبرآبادی شعرا کا ذکر ہے (۱) خان آرزو۔ میر صاحب ان کی نسبت لکھتے ہیں "ہمہ اُستادانِ مضبوط فن ریختہ
ہم شاگردانِ آں بزرگوارند"۔ اب اکبرآباد کی اُستادی سے کس کو انکار ہوگا (۲) میر تقی میر (۳) آبرو (۴) مضمون (۵)
پیام (۶) سجاد (۷) ثاقب (۸) شوق (۹) انسان (۱۰) عارف (۱۱) بہار (۱۲) نثار (۱۳) محسن۔ میر صاحب کی
شہادت ہے کہ یہ سب کے سب عمدہ شاعر تھے۔ سجاد کی نسبت لکھا ہے "سخن او بپایۂ اُستادی رسیدہ"

اُس عہد کی معاشرت | یہ تذکرہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد کی تالیف ہے جب کہ سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ خانہ جنگیوں
اور لوٹ مار کے ہنگامے برپا تھے۔ بدامنی کا دَور دَورہ تھا۔ دائرہ معاش بہت کچھ تنگ ہو چکا تھا۔ اس پر بھی اُس
زمانہ کی معاشرت کی مضبوطی کو دیکھو۔ تمام خطرات اور مصائب سے بالاتر ہو کر اپنی وضع اور صفت پر قایم تھی۔ میر صاحب
کے بیان کو غور سے پڑھو تو صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے شرفا کی خصوصیات یہ تھیں۔ خوبی اخلاق۔ زندہ دلی

مے اُرجیت کا نباہ۔ علم وفن کا ذوق اور اُس کی خدمت۔ سپہگری اور خود داری و وضعداری۔ نکات الشعرا میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے اُن کے ذکر میں ان اوصاف کے عدم اور وجود پر خصوصیت کے ساتھ نگاہ رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُس زمانہ میں ان ہی صفتوں پر نگاہیں پڑتی تھیں۔

فنِ ادب کی خدمت میں بزرگانِ دین۔ شعرا۔ اُمرا۔ طبقۂ اوسط۔ اہلِ قلم۔ اور اہلِ سیف سب کے سب یکساں توجّہ اور انہاک کے ساتھ مصروف تھے۔ جامعیت کو دیکھو۔ حضرت خواجہ میر دردؔ اور حضرت میرزا مظہر قدس سرہما کمالِ درویشی ومعرفت۔ علم۔ فارسی شاعری۔ اُردو شاعری۔ تربیتِ فنِ ادب۔ سپہگری اخلاق ومحبّت سب ہی اوصاف کے جامع تھے اور یہ صورتیں اُس دور میں مستثنیٰ صورتیں نہ تھیں۔ نکات الشعرا میں مذکورۂ بالا طبقات میں سے ہر طبقہ کے اصحاب واشخاص مذکور ہیں۔ جابجا درسگاہیں۔ ادبی مجالس قایم تھیں جہاں کمال کے جوہر چمکتے تھے اور اہلِ کمال پیدا ہوتے تھے۔ سیر اور تماشے کے موقعوں۔ اور مذہبی جلسوں میں اہلِ کمال جمع ہوتے تھے۔ اور اُن کے دَم سے علم وادب کے چرچے رہتے تھے۔ چنانچہ قزلباش خان اُمیدؔ کے حال میں میر صاحب لکھتے ہیں۔ طبقۂ اُمرا میں داخل تھے۔ ہر سیر وتماشہ میں جاتے اور مجلس آراستہ کرتے۔ چنانچہ ایک روز دلی دوستوں کی تحریک سے میں بھی سیّد حسن رسول نما صاحب قدس سرہٗ العزیز کے عُرس میں گیا تھا وہاں اُمیدؔ بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھکو دُور سے دیکھکر کہا۔ خوش باشد۔ میں نے بھی اس زمانہ ریختہ کے دو شعر موزوں کئے ہیں۔ سُنو ؎

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے،	درو دیوار سے اب صحبت ہے،
الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں	تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں

دیکھنا ایک ایرانی نژاد کیسے صاف اور بامزہ اشعار اُردو کے کہہ گیا۔ بقول میر صاحب "یہ فیضِ سخن ہے"۔

ہم ذیل میں میر صاحب کی چند عبارتیں نقل کرتے ہیں اِن سے ہمارے بیان کی تائید ہوگی (اُمید) نکتہ پرداز۔ بذلہ سنج کوچک دل۔ عزیز دلہا۔ یار باش۔ خوش اختلاط۔ خنداں وشگفتہ (مضمون) حریف۔ ظریف۔ ہشاش باش۔ ہنگامہ گرم کنِ مجلسہا (یک رنگ) میگویند کہ بسیار چسپاں اختلاط وآشنائے دُرست بود (سعادت) با بندہ ربطِ بسیار داشت (کلیم) مردے سپاہی پیشہ (حشمت) یعنی میر محتشم علی خاں سپاہی عمدہ روزگار شاعر خوب فارسی در ریختہ ...... باہمہ بعجز وانکسار پیش می آید (حامی) در شمشیر شناسی دستے تمامی دارد ...... در علم تاریخ مہارتے خوب پیدا کردہ۔ از مغتنمات

روزگار ست۔ اگرچہ روزگار با او مساعدت نمی کند (شوق اسپاہی پیشہ (میرحسن) وضع مرد آدمیانہ دارد (غریب) یا دشمس بخیر۔ یک آشنائے بامزہ داشتم۔ بسیار خوش ظاہر بود۔ بسبب پریشانیِ روزگار دو سال ست کہ بسمت بنگالہ رفت (بیتاب) بسیار مربوط مضبوط الاحوال (میرزیہ دُوسرے ہیں۔ غالباً میر سوز) جوانیست بسیار اہلِ خوش طبع (حاتم) مروت جاہل و تمکن....... دیر آشنا۔ غنا ندارد (پاکباز) بسیار کم اختلاط گویا آشنا شدن نداند (خاکسار) خود را دُور میکشد وبسیار سفلگی میکند۔

اگر جُدید تہذیب" بد دماغ نہ ہو تو میں پوچھوں کہ آج کل بھی ان اوصاف کا "سوسائٹی" میں پتا ہی۔ رہے نام اللہ کا

آبحیات اور نکات الشعرا

آپ نکات الشعرا کے خط و خال دیکھ چکے۔ میر صاحب کے اوصاف بھی ظاہر ہو چکے۔ اب نکات الشعرا کا جو چہرہ آبحیات میں نظر آتا ہی اُس کو ملاحظہ کیجئے۔ شمس العلما میر محمد حسین آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں۔ نکات الشعرا شائقِ شعر کے لئے بہت مفید ہی۔ اس میں سوائے اُردو کے بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہی۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اُردو کا پہلا تذکرہ ہی۔ اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ مگر اُن کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ وَلی کہ بنی نوعِ شعرا کا آدم ہی اُس کے حق میں فرماتے ہیں " وے شاعریست از شیطان مشہور تر" (دیکھو آبحیات صفحہ ۹۵ مطبوعہ مفید عام پریس ۱۸۹۹ء) ایک جگہ لکھتے ہیں " اور خانِ آرزو کے پاس اُنھوں نے اور اُن کی شاعری نے پرورش پائی۔ مگر "خاں صاحب" حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ۔ اُس پر نازک مزاجی غضب۔ غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے" (دیکھو صفحہ ۱۸۰) پھر ایک جگہ لکھا ہی "تاہم اُس کے میر صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دُنیا کی کوئی بڑائی اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انھیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا" میر سوز کے حال میں لکھا ہی "سوز مرحوم پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ جب میر تقی مرحوم۔ میر کے تخلص سے عالمگیر ہوئے تو سوز اختیار کیا" ایک دوسرے مقام پر لکھا ہی کہ سوز نے ایک مشاعرہ میں کہا تھا۔ فقیر نے تخلص تو میر کیا تھا مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا فقیر نے خیال کیا کہ اُن کے کمال کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا۔ ناچار سوز اختیار کیا" میر تقی صاحب....

چپ بیٹھے سُنا کیے"۔ جا بجا آبحیات میں یہ بھی ذکر ہی کہ میر صاحب شاعری اور زبان اُردو صرف دلّی والوں کا حق سمجھتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے میر قمر الدین منّت کو شاگرد نہیں کیا۔ لکھنؤ کے شائقین سخن اُن کا کلام سننے آئے تو نہیں سُنایا" (دیکھو صفحات ۲۰۰ و ۲۰۲) ایک اور جگہ لکھا ہی "افسوس یہ ہی کہ اوروں کے کمال بھی اُنھیں دکھائی نہ دیتے تھے۔ اور یہ "میر" سے شخص کے دامن پر نہایت بدنُما دھبّہ ہی۔ جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نیکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔.... خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سَر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ کسی اور کی کیا حقیقت ہی" یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے بیان میں آبحیات میں دیکھتا ہوں تو غرقِ حیرت ہو جاتا ہوں۔ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ماجرا کیا ہی۔ سارے مضمون نکات الشعرا کے بالکل خلاف اور ضد ہیں۔ نکات الشعرا کے دیباچہ میں یہ نہیں ہی کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا ذکر لکھوں گا۔ یہ بھی نہیں ہی کہ اُن کا ذکر نہیں لکھوں کا جن سے دماغ پریشان ہو۔ میر صاحب متعصب یا تنگ نظر نہ تھے بزرگانِ دین کا ذکر جس ادب سے کیا ہی اُس سے اُن کی وسعت مشرب اور پاک دلی صاف ظاہر ہی۔ پھر اُستاد سے کیوں لڑتے اور کیوں بگڑتے۔ میر صاحب۔ خان آرزو کو اپنا اُستاد بلکہ پیر و مرشد بتاتے ہیں۔ آزاد کہتے ہیں "بگڑ کر الگ ہو گئے" میر صاحب نے نکات الشعرا میں اپنے سامنے کے لڑکوں کے کلام کی خوبی بھی تسلیم کی ہی۔ میر سجّاد اُن کے سامنے طالب علم تھے تاہم اُن کی نسبت فرماتے ہیں "سخن او بپایۂ اُستادی رسیدہ"۔ اُن کے ایک شعر پر سَر دُھنتے ہیں۔ وجد کرتے ہیں سو جگہ لکھنے کی تمنّا کرتے ہیں۔ آزاد کا بیان مانا جائے تو وہ سعدی و حافظ کی غزل پر سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے مضمون قصبۂ چاچپو ضلع آگرہ کے رہنے والے تھے اُن کی شاعری کا ذکر میر صاحب نے بہت خوبی سے کیا ہی۔ چاچپو کا باشندہ شاعر ہو سکتا تھا تو سودا نے کیا گناہ کیا تھا۔ وَلی کی نسبت میر صاحب نے یہ ریمارک کیا ہی "از کمالِ شہرت احتیاجِ تعریف ندارد"۔ شیطان والا فقرہ سارے تذکرے میں کہیں نہیں۔ مثل مشہور ہی "وَلی کے گھر میں شیطان"۔ شاید اسی طرح یہ فقرہ آزاد کے ذہن میں پیدا ہوا ہو۔ میر سوز کے تخلص کی نسبت میر صاحب نکات الشعرا میں لکھتے ہیں: "محمد میر۔ میر تخلص جوانیست بسیار اہل خوش طبع۔ ہر چند طرز علٰحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم از و خوش ست"۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ میر صاحب نے تخلص پسند نہیں کیا بلکہ میر سوز نے پسند کیا۔ آزاد نے لکھا ہی کہ "ایک ہزار شعرا میں سے کوئی بیچارہ میر صاحب کے طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا"۔ حالاں کہ میر صاحب نے قریباً سب کو خوبی سے یاد کیا ہی بعض کی نسبت جہاں وقائع نگاری کے فرض نے مجبور کیا البتہ خلاف رائے لکھی ہی مگر وہ بھی طعن اور ملامت کے پیرایہ

ہیں نہیں۔ آزاد نے ہر جگہ میرزا مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام "جان جاناں" لکھا ہے۔ حالاں کہ میر صاحب نے "جان جاں" لکھا ہی جو صحیح ہی۔ ایک شخص نے "جان جاناں" شعر میں باندھا تو میر صاحب نے ٹوکا کہ ایسا خواص کو نہیں چاہیے صحیح نام لکھنا چاہیے۔ عوام کا ذکر نہیں۔ آزاد نے نکات الشعرا کی نسبت لکھا ہی "اب بہت کم یاب ہی" (دیکھو صفحہ ۱۹۲)

میری بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ **نکات الشعرا آزاد کی نظر سے نہیں گزرا**۔ قیاس کی بلند پروازی نے طوطی مینا بنا کر اُڑائے ہیں اور اُن کی سحر بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہی۔

انتخاب اشعار۔ میر صاحب نے جن اشعار کو منتخب کر کے درج تذکرہ کیا ہی دل نہیں مانتا کہ اُن کا نمونہ یہاں نہ دکھاؤں اگرچہ شایقین تذکرہ میں پڑھیں گے مگر قند مکرر ہو تو لطف دوبالا ہو جاتا ہی۔

آرزو	رکھے سیپارۂ گل کھول آگے عندلیبوں کے	چمن میں آج گویا پھول ہیں تیری شہیدوں کے
	وعدے تھے سب خلاف جو تجھ لب سے ہم سُنے	یہ لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا
مظہر	آتش کہو شرارہ کہو کوئلہ کہو	مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو
اُمید	در و دیوار سے اب صحبت ہی	یار بن گھر میں عجب صحبت ہی
	تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں	الحفیظ الحفیظ کرتا ہوں
آبرو	مجلس رنداں میں مت لیجا دلِ بے شوق کو	شیشۂ خالی کی کیا عزت ہی میخواروں کے بیچ
	کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی	اس دلِ بیقرار کی صورت
	دل تو دیکھو آدم بیباک کا	عشق سی پُتلا بھرا ہی خاک کا
	کیا ہوا مر گیا اگر فرہاد	رُوح پتھر سے سر پٹکتی ہے
	اب دین ہوا زمانہ سازی	آفاق تمام دہریا ہے
	حُسن ہی پر خوبرویوں میں وفا کی خو نہیں	پھول ہیں یہ سب پر اِن پھولوں میں ہرگز بو نہیں
یکرنگ	خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن	جب سے تیرا وہ دوستدار ہوا
	اندھیر ہی جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ	ہے سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا
	نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہی	میرا صبر و قرار جاتا ہی

گر خبر لینی ہی تو لے صیاد — ہاتھ سے پھر شکار جاتا ہی

سعادت ہوش کھو دیتی ہیں میرا اُس کی آنکھیں مَی پرست — بسکہ ہوں کم ظرف دو پیالوں ہیں ہو جاتا ہوں مست

واللہ جو سرِ لوح ترا نام نہ ہوتا — ہرگز کسی آغاز کا انجام نہ ہوتا

یار سے جو رقیب لڑتے ہیں — یہ ہمارے نصیب لڑتے ہیں

پپیہے کی طرح دارو کی شیشے — زبانِ حال سے کہتے ہیں پی پی

سودا بیکس کوئی مَرے تو جلے اُس پہ دل مِرا — گویا ہی یہ چراغ غریبوں کی گور کا

زباں ہی شکر میں قاصر شکستہ بالی کے — کہ جن نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

سوداؔ قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

سوداؔ ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا — سُنتا ہی اے دیوانے جب دل دیا تو پھر کیا

پھر دہے شیخ یہ کہتا کہ میں دُنیا سے مُنہ موڑا — الٰہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام — کچھ بھی ای خانہ خراب اس دل کی بہلانے کی طرح

رنگِ گل بے طرح دہکے ہے سن لے ابرِ بہار — آشیاں میرا چھڑک لگتی ہی اب گلشن کو آگ

قاتل کے دل سے آہ۔ نہ نکلی ہوس تمام — ذرہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

کس کی ہیں یہ چمن میں صبا بد شرابیاں — ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں

نہ پوچھ سنگ دل اے شیخ اس صدا کو مان — مرے صنم کی پرستش کر آ خدا کو مان

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں — دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

اِس دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو — قسمت میں جو لکھا ہی الٰہی شتاب ہو

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا مجھے — اے اُلفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

کہتا تھا بنا گوش تری زلف کے آگے — میں صبحِ قیامت ہوں مری شام یہی ہی

نہ ضرر کفر کو نے دین کا نقصاں مجھ سے — باعثِ دشمنی اے گبر و مسلماں مجھ سے

مرجاں کا نخل ہوں نہ پھلوں برگ و بار سے — نکلے ہمیشہ خون میری شاخسار سے

کلیم

خنجر طلب ہی۔ مرگ سی ہر آہوئے حرم
دل پھر گیا ہی کس کی مژہ کا۔ شکار سے

آتی ہی دل پہ قلقلِ مینا سی اب شکست
وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

درازیِ شبِ ہجرانِ زلفِ یار کلیم
نہ مجھسے پوچھ۔ کہ کاٹی ہی رات آنکھوں میں

پاسِ ناموسِ محبت ہی مجھے از بس کلیم
باغ میں جاؤں نہ ہرگز بے رضائے عندلیب

جو صدا آتی ہی اس وادی سے ہی سینہ خراش
یہ کوئی دل روتا جاتا ہی۔ نہیں بانگِ جرس

تو یار مل کے ہم سے جب ایک ہو گیا ہو
کس کو بعید مانیں کس کو کہیں قریں ہم

تم ہو تو ہم کہاں ہیں ہم ہیں تو تم کہاں ہو
یا تم ہی سب ہو ہم میں یا سب کے سب ہیں ہم

نے اور طنبور میں یہ سوز تو معلوم اے مطرب
کسی کا دل ہوا ہی شاید اس پردہ میں آنالاں

تری جناب میں آیا ہوں یا الٰہ نہ پوچھ
یہی کہ بخشدے اور مجھسے گناہ نہ پوچھ — [illegible]

[illegible] — غرورِ حسن کیا ممکن کسی کو داد کو پہنچے
غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

تو اے بارانِ رحمت اوج میں آموج سے اپنی
کہ یک قطرہ میں میری کشت کا بھی کام ہو جاوے

درد

اکسیر پر مہوس اتنا نہ ناز کرنا
ہی کیمیا سے بہتر دل کا گداز کرنا

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نیں آنکھ بھر دیکھا

نالہ فریاد آہ اور زاری
آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

حرص کرواتی ہی رُو بہ بازیاں سب ورنہ یاں
اپنے اپنے بوریے پر جو گدا تھا شیر تھا

کھنچے ہی دور آپ کو میری فروتنی
اُفتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

ہم تجھسے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک دم میں یہ کثرت نمائیاں
گر آئینہ کے سامنے ہم آ کے ہُو کریں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ہی اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے درد آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

اُس نے کیا تھا یاد مجھے بھول کر کہیں — پاتا نہیں ہوں تب سے میں اپنی خبر کہیں

فرصتِ زندگی بہت کم ہے — مغتنم ہے یہ دید جو دم ہے

دین و دنیا میں تو ہی ظاہر ہے — دونوں عالم کا ایک عالم ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا — تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

رُوندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے — اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

اے گُل تو رخت باندھ اُٹھاؤں میں آشیاں — گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغباں مجھے

پتھر تلے کا ہاتھ ہے غفلت کے ہاتھ دل — سنگِ گراں ہوئی ہے یہ خوابِ گراں مجھے

وحدت نے ہر طرف تری جلوے دکھا دیئے — پردے تعینات کے جو تھے اُٹھا دیئے

یارب تھی کیا خرام وہ جس نے اک آن میں — کتنے ہی مُردے حشر سے آگے جلا دیئے

سیلابِ اشکِ گرم نے اعضا مرے تمام — اے درد کچھ بہا دیئے اور کچھ جلا دیئے

سجاد

شتابی پلا دے کہ جاتا ہے ابر — جو کچھ باقی ساقی رہی ہو شراب

اس فصلِ گُل میں جوشِ جنوں کا ہوا ہے قہر — جنگل میں آ بھرا ہے نکل کر تمام شہر

اب تو ہم نے کیا گریباں چاک — تیرے دامن کو کس طرح چھوڑیں

کس طرح کوہکن پہ گزرینگی — ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

میں جو اُس کی گلی میں جاتا ہوں — دل کو کچھ گم ہوا سا پاتا ہوں

لبِ شیریں پہ اُس کے مرتا ہوں — زندگی اپنی تلخ کرتا ہوں

رات اُس زلف کا وہ افسانہ — قصہ کوتہ بڑی کہانی ہے

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے — جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

ماہرو بن یہ شمع محفل میں — جیسی روشن ہے سب پہ روشن ہے

بیتاب

تڑپ کر مر گئی بلبل قفس میں — پڑی تھی ہائے کس ظالم کے بس میں

یقین

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس — کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

رُ داگر دیجے اُس کو بھی تو کچھ عیب نہیں
آئینہ سے بھی گیا گیا دلِ حیراں میرا

نہ تھا عیش کی خسرو کو فرصت قصرِ شیریں میں
جو میں ہوتا تو جائے شیر جوئے خوں واں کرتا

خال گورے مکھ کا لیتا ہی مرے دل کو چرا
اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پڑتے ہیں چور

اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جامِ شراب
دیکھکر چھائی بھری آتی ہے باراں کی طرف

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھکو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دِوانہ پن میں

دوبارہ زندگی کرنا مصیبت اس کو کہتے ہیں
پھر اُٹھنا بیدماغوں کا قیامت اس کو کہتے ہیں

زنجیر میں زلفوں کے پھنس جانے کو کیا کیئے
کیا کام کیا دل نے دیوانہ کو کیسا کیئے

وَلی

دشمنِ دیں کا دین دشمن ہی
راہزن کا چراغ دشمن ہی

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہی اُس کو
کرتی ہی نگہ جس قدِ نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانۂ ساقی
کہ دل سی تاب جی سے صبر سر سے ہوش لیجاوے

عجب کچھ لطف رکھتا ہی شبِ خلوت میں دلبر سے
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

عُزلت

بجز رفاقتِ تنہائی آسرا نرہا
سوائے بیکسی اب اور آشنا نرہا

سراج

نہیں ہی تاب مجھے سامنے تری جاناں
کہاں سراج کہاں آفتابِ عالمتاب

شکر للہ ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا
شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا

تاباں

قد حلقۂ کماں اسی حسرت میں ہو گیا
تیرِ ہدف کبھی نہ ہماری ہوئی دعا

لگ رہی ہیں ترے عاشق کی جو آنکھیں چھت سے
تجھکو دیکھا مگر اُن نے ہے لبِ بام کہیں

بال اپنے کھولتا ہے جب تو اے خورشید رُو
چاند سے مُنہ پر تری اُس وقت آجاتا ہی ابر

ساقی ہو اور چمن ہو مینا ہو اور ہم ہوں
باراں ہو اور ہوا ہو سبزا ہو اور ہم ہوں

ایمان و دیں سے تاباں مطلب نہیں ہی ہم کو
ساقی ہو اور مے ہو دُنیا ہو اور ہم ہوں

جوں برگِ گل سے باغ میں شبنم ڈھلک پڑے
کیا ہو کہ برگِ تاک سے یوں مے ٹپک پڑے

محفل کے بیچ سُن کے مرے سوزِ دل کا حال
بے اختیار شمع کے آنسو ڈھلک پڑے

ہاتھ بیفائدہ زندہ میں نہ دوڑا مجنوں | طوق ہی تیرے گلے میں یہ گریباں تو نہیں
میں گورِ غریباں پہ جا کر جو دیکھا | بجز نقشِ پا لوحِ تربت نہیں ہی
نہ پائی خاک بھی تا آں کی ہم نے پھر ظالم | وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا
ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے | تجھے بے مروّت محبت کہاں ہی
تری ابرو سے نہ چھوٹے گا مرا دل ہرگز | گوشت ناخن سے بھلا کوئی جدا ہوتا ہے
قیامت مجھ پہ کل کی رات اُس کے ہجر میں لائی | نہ آیا یار میرا آج بھی وہ رات پھر آئی

شوق
سمجھے گی آتشِ دل ہم نے جانا تھا گھٹا آئی | ہوا ای ابر نے دونی وسلے یہ آگ بھڑکائی

رُسوا
ہر گلی میں گر پڑے ہیں مست ہو دیوار و در | ابر رحمت برستا ہے یا برستی ہے شراب

قایم
بھلا اے ابرِ مژگاں اب تو بس کر | ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر
بہارِ عمر ہے قایم کوئی دن | لے سے جوں گُل بیاری کاٹ ہنس کر
اے محنت آزمائے عاشق | تب خوش ہو کہ مر ہی جائے عاشق

دانا
ہر صورت خدا کو دیکھنا عنوان ہے میرا | یہی توحید میں مصرع سرِ دیوان ہے میرا

سلام
حدیثِ زلف چشمِ یار سے پوچھ | درازی رات کی بیمار سے پوچھ
بتا بو قسم ہے تمھیں میری صبر کی | مُلنے میں بعد ذبح تحمل نہ کیجیو

بہار
ہمیں واعظ ڈراتا کیوں ہی دوزخ کے عذابوں سے | معاصی گو ہمارے بیش ہوں کیا مغفرت کم ہی

تمکیں
حسن اور عشق کو جس روز کہ ایجاد کیا | مجھکو دیوانہ کیا تجھکو پریزاد کیا

محسن
تعزیت دار حسرتِ دل ہے | یہ جو گریہ کا جامہ آبی ہے
دل پُر آبلہ مرا محسن | رشکِ آئینۂ حبابی ہے

راقم
ابرِ تر سے چشمِ گریاں کم نہیں | موجِ دریا ہے شکنجِ آستیں
مژگاں سی دل بچے تو ٹکڑے کرے ہی ابرو | یہ کہکے میں نے اُس سی جب دل کی داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہووے خالی | تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اے باغباں نہیں تری گلشن سے کچھ غرض
مجھکو قسم ہی چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں

اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب
آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھکر کہیں

معصیت میری بہت ہی کہ تری بخشش بیش
اپنی رحمت پہ نظر کر مرے عصیاں کو نہ دیکھ

کہے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے
اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر

جو چاہے گوہرِ مقصود اے دل
صدف کی طرح تو پاسِ نفس کر

(محمد) میر/میر شہرۂ حسن سے ازبسکہ وہ محبوب ہوا
اپنے چہرے سے بگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

(میر محمد تقی) میر کس طرح سے مانئے یاراں کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اُڑا جاتا ہی ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

شبِ درد و غم سے عرصہ مری جیو پہ تنگ تھا
آیا شبِ فراق تھی یا روزِ جنگ تھا

مت کر عجب جو میر ترے غم میں مر گیا
جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا

ہونا نہ چار چشم دل اُس ظلم پیشہ سے
ہشیار زینہار خبردار دیکھنا

ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم
عمر گزری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

جو اے قاصد وہ پوچھے میر بھی ایدھر کو چلتا تھا
تو کہیو جب چلا ہوں میں تو اُس کا دم نکلتا تھا

کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا

یک قطرہ خون ہوکے مژہ سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

مت پوچھ کس طرح سے کٹی رات ہجر کی
ہر نالہ میری جان کو تیغ کشیدہ تھا

خواہ مجھسے لڑ گیا اب خواہ اُس سی مل گیا
کیا کہوں اے ہمنشیں میں تجھسے حاصل دل گیا

مت ڈھلک مژگاں سی میرے ای سرشکِ آبدار
مفت ہی جاتی رہیگی تیری موتی کی سی آب

میرے سنگِ مزار پر فرہاد
رکھکے تیشہ کہے ہی یا اُستاد

ہم تو اسیرِ کنجِ قفس ہوکے مر چلے
اے اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر

پاس رہنے کا نہیں ایک بھی تار آخر کار
ہاتھ سے جائیگا سر رشتۂ کار آخر کار

ساقی تو ایک بار تو توبہ تڑا مری
توبہ کروں جو پھر میں تو توبہ ہزار بار

دل دماغ اور جگر یہ سب اِکبار — کام آئے فراق میں اے یار

احوال نامہ بَرسے مرا سُن کے کہہ اُٹھا — جیتا ہے وہ ستم زدہ مہجور کیا ہنوز

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دلخراش — جیوہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گُل

بھلا تم نقدِ دل لے کر ہمیں دشمن گنو اب تو — کبھی کچھ ہم بھی کرلیں گے حسابِ دوستاں در دل

زبانِ نوحہ گرہوں میں قضا نے کیا ملایا تھا — میری طینت میں یارب سُودۂ دلہائے نالاں کو

سمجھے ہی نہ پروانہ نہ تھا نبے ہی زباں شمع — وہ سوختنی ہے تو یہ گردن زدنی ہے

میرؔ پھر کہیو سرگزشت اپنی — بارے یہ کہہ مزاج تو خوش ہی

صد کارواں وفا ہے کوئی پوچھتا نہیں — گویا متاعِ دل کے خریدار مرگئے

آتش کے شعلے سر سے ہمارے گزر گئے — بس اے تپِ فراق۔ کہ گرمی میں مرگئے

ناصح نہ روویں کیونکہ۔ محبّت کے جیو کو ہم — ای خانماں خراب ہمارے تو گھر گئے

بے کلی مارے ڈالتی ہے نسیم — دیکھئے اب کے سال کیا ہووے

میرے تغیرِ حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

رُباعی

مسجد میں تو شیخ کو خروشاں دیکھا — میخانہ میں جوشِ بادہ نوشاں دیکھا

اِک گوشۂ عافیت جہاں میں ہم نے — دیکھا سو محلۂ خموشاں دیکھا

تجویز بقائے اُردو

از

جناب مولوی سید غلام بھیک صاحب نیرنگ بی اے، ال ال بی

خیرپور میرس کے سفر میں میں نے وعدہ کیا تھا کہ انجمن ترقی اُردو کے کام کے متعلق ایک خاص خیال آپ کی خدمت میں پیش کرونگا۔ آج تک کئی مرتبہ دھیان آیا کہ لکھوں مگر آج سے پہلے فرصت نہ ملی۔ آج ایفائے وعدہ کرتا ہوں۔

چونکہ کسی زبان اور کسی ادب کا مستقبل اس کے حال سے اور حال اس کے ماضی سے بے تعلق نہیں ہو سکتا اس لیئے اُردو میں بھی آیندہ جو کچھ ہوگا وہ اس کی موجودہ حالت سے متاثر ہوگا۔ اور اُس کی موجودہ حالت اس کی گزشتہ حالت سے یقیناً متاثر ہے۔ اس وقت اُردو کے ادب میں عربی اور فارسی کے الفاظ ترکیبیں بلکہ جملے کے جملے کثرت سے مستعمل ہیں۔ نظم و نثر کی کتابوں میں ایسی تلمیحات بکثرت موجود ہیں جن کے سمجھنے کے لیئے کبھی کبھی عربی ادب کی واقفیت اور زیادہ تر فارسی ادب کی شُدبُد کی ضرورت ہے۔ اُردو کے گزشتہ اور موجودہ شعراء اور دیگر مصنفین کی تصنیفات کو ٹھیک طور سے سمجھنے اور اُن سے لطف اندوز یا مستفید ہونے کے لیئے عربی و فارسی زبان و ادب کی فی الجملہ واقفیت اور مذاق ضروری ہے۔

ایک طرف تو واقعات یہ ہیں۔ دوسری طرف تعلیم جدید کی ضرورتوں نے محض ادیبانہ مذاق کی تعلیم کو بے سود ب کر دیا ہے۔ اُمید نہیں کہ ہم آیندہ محض زبان و ادب کو اتنا وقت دے سکیں کہ ہمارے بچے نہ صرف اُردو زبان و ادب بلکہ عربی و فارسی زبان و ادب بھی حاصل کیا کریں۔ خاص خاص لوگ عربی زبان و ادب بھی سیکھا کرینگے

اور ضرورت ہی کہ سیکھیں - خاص ہی خاص لوگ فارسی زبان و ادب بھی حاصل کیا کرینگے - مگر ایسے لوگوں کی فیصدی تعداد بہت ہی کم ہوا کریگی - اب بھی بہت کم ہی مگر آیندہ یقیناً اس سے بہت کم ہوا کریگی - زیادہ تر علوم تجربیہ سیکھنے پڑینگے - بہت سا وقت ریاضیات و معقولات کی نذر ہوا کریگا - تاریخ وغیرہ بھی اپنا حصّہ لینگی - اور زباندانی اور تحصیل علم ادب کے لیئے بہت کم وقت بچ سکیگا - ایسے حالات میں اگر ہمارے بچے اُردو زبان و ادب بھی اچھی طرح سیکھ جایا کرینگے تو کافی ہوگا -

لیکن اُردو زبان و ادب کو فارسی و عربی زبان کی واقفیت کے بغیر سیکھیں گے کیونکر؟ غالب کو رہنے دیجئے میر تقی اور خواجہ حالی کا کلام یا مرزا داغ اور امیر مینائی کا کلام ادق نہیں ہی پھر بھی کون ہی جو فارسی زبان و ادب کے مذاق کے بغیر ان حضرات کے کلام کو بھی سمجھ سکے ؟

اِس مشکل کا علاج میرے نزدیک یہ ہی کہ اُردو میں لغات اور قواعد کی کتابیں اُس نمونے پر لکھی جائیں جیسی انگریزی میں کثرت سے موجود ہیں - دیکھئے انگریزی زبان و ادب کے جاننے اور سمجھنے کے لیئے بھی یونانی و لاطینی اور بعض دیگر زبانوں کی کچھ واقفیت اور اُن زبانوں کے ادب کا کچھ مذاق ضروری ہی - مگر انگریزوں نے اس مشکل کو حل کر لیا ہی - انگریزی گریمر کی کتابوں میں اشتقاق الفاظ کے متعلق ایسے ابواب موجود ہیں جن کے مطالعے سے یونانی و لاطینی الفاظ کی پہچان اور ان کا طریق اشتقاق بخوبی معلوم ہو جاتا ہی - غیر زبانوں کی جو ترکیبیں یا جملے بتعداد مستعمل ہیں ان کی فہرست بہ ترتیب حروف تہجی معہ ترجمہ انگریزی لغت کی کتابوں میں موجود ہی - الفاظ دخیلہ کا اشتقاق کتب لغت میں اس قدر تشریح اور وضاحت کے ساتھ درج ہی کہ جو شخص صرف انگریزی جانتا ہی وہ اُن کے کی جڑ کھوج سے پوری واقفیت حاصل کر سکتا ہی - تلمیحات کے حل کے واسطے لغات قصص الگ موجود ہیں -

ضرورت ہی کہ اُردو میں بھی ایسی کتابیں تصنیف کی جائیں - قواعد اُردو کی کتابوں میں فارسی کی ترکیب اضافی ترکیب توصیفی اسم فاعل ترکیبی وغیرہ کے قواعد اور اُن کی مثالیں داخل کی جائیں - عربی کے اسم فاعل اسم مفعول صفت مشبہ اسم ظرف اسم آلہ وغیرہ کے قواعد بھی درج کیئے جائیں - فارسی کے ایسے مصادر کی ایک فہرست بھی لگا دی جائے جن کے مشتقات اُردو میں مستعمل ہوتے ہیں - اِس وقت تمام ضروری امور کا استقصا کرنا میرا مقصد نہیں ہی - میں نے اشارۃً و مثالاً چند باتیں لکھدی ہیں - انگریزی میں (Hiuts on the Study of English by Rowe and Webb)

یا (Nesfield's English Grammar) اور فارسی میں آزاد کی جامع القواعد نمونے کے واسطے عمدہ کتابیں ہیں - اِن نمونوں کو سامنے رکھ کر اُردو کی ایک جامع و مانع گریمر تیار کی جائے - جب ایک دفعہ ایک عمدہ نمونہ تیار ہو گیا تو آیندہ اُس سے بہتر کتابیں بھی تصنیف ہونگی - اِسی طرح انگریزی میں (Dictionary of Phrase & Fables Rogets, Taeasurus of English words and phrases) اور کوئی عمدہ ڈکشنری مثلاً (Webster's Dictionary یا Ogilvie's Imperial Dictionary) ہمارے لغات کے لیئے نمونہ بن سکتی ہیں - ان میں الفاظ اور محاورات انتہائے جامعیت کے ساتھ مع اشتقاق و معانی مختلفہ و امثلہ استعمالات مختلفہ جمع اور درج کیئے جائیں اور آخر میں عربی جملے اور ضرب المثلیں فارسی جملے اور ضرب المثلیں جو اُردو ادب میں پائی جاتی ہیں بترتیب حروفِ تہجی مع ترجمہ اُردو درج کی جائیں - علاوہ ازیں اساتذہ شعرائے اُردو اور بہترین تصانیف نثر اُردو کے عمدہ لائبریری ایڈیشن تیار کیئے جائیں جن میں مشکل اور شرح طلب مقامات پر واضح اور عمدہ حواشی لکھے جائیں -

میں جانتا ہوں کہ یہ اور اسی قسم کے کام سخت محنت اور بڑے مصارف کے محتاج ہیں - لیکن گریمر سے شروع کیا جائے اور اِس کے بعد لغت پر توجہ کی جائے - لائبریری ایڈیشن کا کام بعد میں کیا جا سکتا ہے - گریمر کے واسطے غالباً کوئی معقول انعام تجویز کر کے اشتہار دینا مفید ہوگا - لغت کے واسطے چار پانچ اعلیٰ قابلیت سے اشخاص کو مل کر کام کرنا ہوگا - یہ لوگ تنخواہ دار ہوں اور صرف یہی کام کریں اور ایک میعادِ معیّنہ کے اندر حسبِ اطمینان تکمیل لغت کر دیں تو اُن کو ایک معقول انعام کا متوقع بھی کیا جائے -

انجمن ترقی اُردو لازمی طور پر انجمن بقائے اُردو بھی ہے - اگر خدانخواستہ زبان اُردو نذر فنا ہو گئی تو ترقی کس کی ہوگی ؟ اس لیئے ترقی سے پہلے بقا کی فکر ضروری ہے - میرے خیالِ ناقص میں جو کچھ آیا وہ عرض کر دیا - اب اس کی فکر کرنا آپ کا کام ہے - زبانِ اُردو اور انجمنِ ترقی اُردو کی بیدار بختی ہے کہ اعلیٰ حضرت سلطان دکن خلد اللہ ملکہٗ کے دامانِ کرم کا سایۂ ہما پایہ اِن کے سر پر ہے - اُمید ہے کہ مصارف کے متعلق جو مشکلات ہیں وہ انشاءاللہ آسان ہو جائینگی - آپ از راہِ کرم جلد سے جلد میری اس تجویز کے متعلق کوئی عملی کارروائی کریں - زیادہ نیاز - والسلام



تجویز

دربارۂ اِصلاحِ رسمُ الخط

(از جناب عبداللہ یوسف علی صاحب سی بی ای۔ ایم اے۔ ایل ایل ایم)



مسٹر عبداللہ یوسف علی بلحاظ اپنی علمی قابلیت اور فضیلت کے ہماری قوم کے ممتاز لوگوں میں سے ہیں اور اس لیئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ کچھ عرصہ ہوا آپ نے مجھ سے اُردو رسم الخط کی اصلاح کے متعلق خط وکتابت کی۔ اس کے بعد لندن کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ "بلیٹن" میں ایک مختصر سا مضمون لکھا۔ میں اُن کی تجویز کو اُنھیں کے الفاظ میں یہاں درج کرتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اُردو کے انشا پرداز اور ادیب اپنی رائے اور تنقید سے ہمیں مستفید فرمائینگے۔ ہم نہایت خوشی سے اُردو رسم خط کی اصلاح کی بحث کو اس رسالہ میں جاری رکھینگے۔

(اڈیٹر)

میں یہاں اُردو رسمِ خط پر ایسی بحث کرنا نہیں چاہتا جو اس مسئلہ کے ہر پہلو اور جزو پر حاوی ہو بلکہ صرف دو اُمور کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

اوّل یہ کہ اُردو رسمِ خط میں یکسانی ہونی چاہیئے۔ دوم یہ کہ بعض حروف میں صحیح طور سے آوازوں کے اظہار کے لیئے کچھ خفیف سا تغیر کیا جائے۔

یکسانی کا سوال خصوصاً اُس وقت پیش آتا ہی جب کہ ہم مرکبّ افعال یا ایسے مرکب الفاظ سے بحث کرتے ہیں جن میں لاحقے لگے ہوتے ہیں۔

میں ہندوستان کے سنگی مطبع کی چھپی ہوئی ایک کتاب لیتا ہوں اور ایک ہی صفحہ میں مفصلۂ ذیل الفاظ دیکھتا ہوں۔

ترقی کرتا جائے گا	رہیگا	ہو جائیں گے	رہے گی
کردیجائے	دیکھتے دیکھتے	دودھ پلانے والا حیوان	

سنگی مطابع کی چھپی ہوئی کتابوں میں الفاظ کے درمیانی فصل کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ لیکن ٹائپ کی چھپی ہوئی اور خاصکر یورپ کی مطبوعہ کتابوں میں اِس کا بہت خیال کیا جاتا ہی۔ تاہم اس کے متعلق چند ایسے اصول قایم کئے جا سکتے ہیں جو تمام صورتوں پر حاوی ہوں۔

"دیکھتے دیکھتے" ہی کو لیجئے۔ یہ کیوں بلا فصل لکھے یا چھاپے جائیں؟ یہ دو جُدا جُدا لفظ ہیں اور محض نحوی تکرار کی وجہ سے انھیں بلا فصل لکھنا جائز نہیں۔

"کردی جائے" ایک مرکب فعل ہی۔ جو تین مختلف افعال سے مل کر بنا ہی۔ اِن میں سے ہر ایک الگ الگ لکھا جانا چاہیئے۔ "کرتا جائیگا" میں دو فعل ہیں۔ یعنی کرتا اور جائیگا، اگرچہ جائیگا خود مرکب ہی جس میں ایک لاحقہ لگا ہوا ہی۔ چونکہ لاحقہ خود کوئی مستقل معنے نہیں رکھتا لہٰذا ہم اُسے اُس لفظ سے ملا کر لکھتے ہیں جس سے وہ متعلق ہی۔

میں اس کے متعلق یہ قاعدہ قایم کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ جن مرکبّ افعال یا الفاظ کے اجزائے ترکیبی مستقل الفاظ ہیں تو اُن کے ہر جزو کو الگ الگ لکھا اور چھاپا جائے۔

۲۔ جہاں کوئی ایسا لاحقہ یا سابقہ ہی جو مستقل معنی نہیں رکھتا تو اُسے اُس لفظ سے ملا کر لکھا جائے جس سے وہ متعلق ہی۔

وہ سات مثالیں جو میں نے شروع میں لکھی ہیں اس قاعدے کے رو سے یوں لکھی جائینگی۔

رہیگی	ہو جائینگے	رہیگا	ترقی کرتا جائیگا

دُودھ پلانے والا حیوان — دیکھتے دیکھتے — کردی جائے

اگر ہم حروف ربط و جار کو مستقل الفاظ قرار دیں تو شاید جائز خیال نہ کیا جائیگا، لیکن جب دوسری ترقی یافتہ زبانوں کو دیکھتے ہیں تو یہ اُصول صحیح معلوم ہوتا ہی۔ مثال کے طور پر ہم چند الفاظ لکھتے ہیں۔

صحیح		غیر صحیح
گھاٹ پر	نہ کہ	گھاٹپر
دوپہر سے	نہ کہ	دوپہرسے

یہاں دوپہر ایک مرکب لفظ ہی۔

لڑکے کو	نہ کہ	لڑکیکو
بہ دستور	نہ کہ	بدستور

حروفِ اضافت کے معاملہ میں بھی کسی قاعدے کی پابندی نہیں کی جاتی۔ میری رائے میں انھیں بھی دوسرے حروفِ ربط و جار کی طرح الگ لکھنا چاہیئے۔ مثلاً

صاحب کا	نہ کہ	صاحبکا

اب تیسرے قاعدے کی صورت یہ ہوگی۔

۳۔ حروفِ ربط و جار مستقل الفاظ کی طرح الگ الگ لکھے اور چھاپے جائیں۔

اُردو میں بہت سے مرکب اسماء اور صفات ہیں۔ انگریزی میں اس قسم کے مرکبات کو خطِ فصل کے ساتھ لکھتے ہیں۔ (مثلاً کن پھٹا انگریزی میں (Kan-phata) لکھا جائیگا۔ لیکن ہمارے لیئے ایسی صورتوں میں صحیح اُصول یہ ہوگا کہ ہم دونوں لفظوں کو پاس پاس بلا فصل لکھیں۔ یعنی جب ہم دو مختلف لفظ ایک ساتھ لکھتے ہیں تو اُن میں تھوڑا سا فصل رکھتے ہیں۔ ان مرکبات میں کے الفاظ میں کوئی فصل نہ ہونا چاہیئے، لیکن ایک کے حروف دوسرے میں نہ ملا دیئے جائیں مثلاً

کن پھٹا	نہ کہ	کنپھٹا

کام چور	نہ کہ	کامچور

یہ گویا چوتھا قاعدہ ہوا۔

۴۔ ایسے مرکب الفاظ جو دو مستقل الفاظ سے مل کر بنیں (جو عموماً اسما یا صفات ہوتے ہیں) تو اُن کے درمیان کوئی فصل نہ ہونا چاہیئے، لیکن ایک کے حروف دوسرے کے حروف میں نہ ملا دیئے جائیں۔

اب میں دوسرے امر کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ صحیح آوازوں کے اظہار کے لئے بعض اُردو حروف کی شکلوں میں خفیف سا تغیر ضروری ہے۔

اوّل یؔ کو لیجئے۔ اِس کی تین آوازیں ہیں۔

معروف	جیسے	دہلی
مجہول	جیسے	لڑکے کو
ماقبل فتح	جیسے	ہے۔ بیٹا

یہ تین صُورتیں پہلے سے مستعمل ہیں۔ لیکن یہ اُسی وقت کام آسکتی ہیں جب کہ یؔ لفظ کے آخر میں ہو۔ مگر اس قاعدے کی بھی عموماً پابندی نہیں کی جاتی۔ عام طور پر صرف پہلی دو صورتیں استعمال کی جاتی ہیں اور مطبوعہ کتابوں میں بھی یہی رائج ہے۔ تیسری صورت کو بھی وہ دوسری صورت ہی سے ظاہر کرتے ہیں۔ میری رائے میں تینوں صورتوں کو لفظاً کے ساتھ قایم رکھنا چاہیئے۔ اور ٹائپ بھی اِسی اُصول کے مُطابق بنایا جائے۔

اب مشکل اُس صُورت میں پڑتی ہے جب یؔ الفاظ کے بیچ میں آتی ہے، شروع میں اِس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اِس بارے میں میری تجویز یہ ہے کہ نقطوں کے ذریعہ سے اِن آوازوں کا امتیاز ظاہر کیا جائے۔ اِس طریقہ میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایک اجنبی شخص بھی پڑھنے میں غلطی نہ کریگا۔

یائے معروف کے لیئے ہم یؔ کے دو نقطے پاس پاس لکھینگے جیسا کہ عام طور پر یؔ کے نقطے لکھے جاتے ہیں۔ جیسے کھیر، ہیرا۔

بھائی (برادر) بہائی (بہا کا پیرو)

تحریر میں اِس قاعدے کی پابندی ضرور ہونی چاہیئے۔

یورپ کے مطابع میں ٹ ڈ ڑ میں بجائے ط کے چار نقطے دیتے ہیں مثلاً

ٹ ڈ ڑ

میری رائے میں یہ درست نہیں۔ ہمارے ہاں جو قاعدہ رائج ہے وہ زیادہ بہتر ہے۔ اور اُنہیں بھی یہی اختیار کرلینا چاہیئے۔

(باقی آئندہ)



مجہول کے لیئے بجائے نقطوں کے ایک چھوٹا سا باریک خط کھینچ دیا جائے - جیسے گھیرا ڈیرا -
ماقبل فتح کے لیئے مجھے سرای ڈینیسن رس اس نے ایک بات سمجھائی جس کے لیئے میں اُن کا ممنون ہوں
کہ نقطے ایک دوسرے کے نیچے لکھے جائیں - جیسے پیہا کہا -
اُردو میں ایسے الفاظ کچھ کم نہیں ہیں جن کی صورت تو ایک ہی مگر محض درمیانی حروفِ علت کی آواز کے اختلاف سے
اُن کے معنی مختلف ہو جاتے ہیں - مثلاً

بیر (بہادر، سورما)

بیر (ایک قسم کا پھل)

بیر (عداوت)

بہ نظرِ صحت لکھنے میں مناسب امتیاز کا اظہار ضروری ہے -

یہی حالت و کی ہے - اِس کی بھی تین آوازیں ہیں - اور امتیاز پیدا ہو سکتا ہے -
معروف کے لیئے معمولی و لکھا جائے - مثلاً تھوک -
مجہول کے لیئے و کا نیچے کا سرا ذرا آگے کو بڑھا دیا جائے دو - رو -
ماقبل فتح کے لیئے نیچے کے حصّہ کو حلقہ بنا دیا جائے - جیسے جو (اناج)
اِس حرف میں ابتدائی اور درمیانی صورتوں کے امتیاز کی ضرورت نہیں پڑتی -

اب ن کا معاملہ رہ گیا - اِس کی دو آوازیں ہیں ایک تو معمولی دوسری غنّہ - غنّہ کی بھی دو حالتیں ہیں
ایک جب نون لفظ کے آخر میں آتا ہے دوسرے جب وہ درمیان میں استعمال ہو - آخر کی صورت تو آسان ہے
کہ وہ بغیر نقطے کے لکھا جاتا ہے - جیسے کریں نہیں
درمیانی نون غنّہ کے لیئے کوئی اور صورت پیدا کرنی چاہیئے - میری رائے میں ایسے نون کے لیئے اوپر خالی
حلقہ بنا دیا جائے - جیسے گنوار اینٹ کنور

ہندی حروف جن میں ہ الگ آواز دیتی ہے اور دوسرے حرف سے مل کر ایک حرف ہو جاتے ہیں
انھیں دوچشمی (ھ) سے لکھا جاتا ہے اور جو ہ الگ آواز دیتی ہے اُس کی صورت دوسری ہے - مثلاً

مُصَنّفین و شعرائے تیموریہ

(از تاریخ ادبیات ایران جلد سوم مؤلفہ پروفیسر ای جی براؤن کیمبرج)

پائدار حکومت شاعرانہ بلند پروازی کے لئے ضروری چیز نہیں

گزشتہ سطور میں اشارہ کرچکے ہیں کہ بہترین شاعری عموماً آشوب و تلاطم کے زمانوں میں پیدا ہوا کرتی ہے، بخلاف اس کے امن و خوشحالی اور پائدار حکومت کے زمانوں میں شاعری کی زمین بنجر ہوجاتی ہے۔ یہ صورت جس قدر عجیب و غریب ہے اُسی قدر اعتراض سے پاک اور حقیقت سے قریب ہے اور کم از کم ایران کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔ عہد صفویہ (۱۵۰۲ - ۱۷۳۶) خاص کر سولھویں صدی میں اضلاع عجم کو جو طاقت و توانائی اتفاق و یکجہتی اور سکون و فارغ البالی میسر تھی وہ ازمنۂ جدید میں اس کو کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اگرچہ یہ زمانہ ایران کے فوجی عظمت و عروج، قومی ایتلاف و فروغ تجارت و صنعت خصوصاً فن تعمیر و مصوری طبعیات و علوم اور مخصوص طور پر دینیات کے لحاظ سے شہرۂ آفاق تھا۔ لیکن اس میں تقریباً ایک شاعر بھی ایسا نہ ہوا جس کی ذہانت اقلیم شعر کی فرمانروا، اور جس کی شہرت اکناف زمین کی ایک مالک تسلیم کی جاتی۔ اس خصوصیت کے اسباب کی بحث اُس مقام پر آئیگی جہاں دور صفویہ کی داستان درج ہوگی، لیکن بخلاف اس کے دور تیموریہ میں، جس کے علمی کارناموں کو ہم اس باب میں چھیڑنا چاہتے ہیں اور جس کے حالات گزشتہ باب میں ناظرین پر ہویدا ہوچکے ہیں، بدنظمی و فساد، اور خونریزی و عناد کا ایک طوفان برپا تھا، تاہم اس کے مقابلے میں مشکل سے ستّر سال (۱۳۳۵ - ۱۴۰۰) کا کوئی مسلسل دور پیش کیا جاسکتا ہے جس نے جلیل القدر شعرا کی اسقدر رنگا رنگ محفل تیار کی ہو۔ یہ وہ محفل ہے جس کا ایک ایک سخن طراز اپنا جواب نہ رکھتا تھا اور حافظ اعظم اُن میں صرف ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اس کا مرتبہ سب سے سوا ہے، غالباً بہت سے چھوٹے چھوٹے درباروں کا وجود شاعرگری کے لئے مفید ہے، سبب یہ ہے کہ ان میں رقابت کی چوٹیں چلتی رہتی ہیں، ایک دربار دوسرے کو مسابقت کی دوڑ میں پیچھے چھوڑنا چاہتا ہے، شاعر بھی اگر ایک جگہ سے ناکام پھرتا ہے

تو دوسری جگہ آسانی سے داد وصلہ حاصل کر لیتا ہے، لیکن جب ملک بھر میں ایک ہی دربار ہو تو بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، جو مدعی فن موقعہ نہ پانے یا بدبختی و مصائب اور حاسدوں کی دراندازی نہ کہ اپنی بدلیاقتی سے یہاں تشنہ لب و مایوس ہو جاتا ہے وہ غالباً ہمیشہ کے لیئے بیٹھ جاتا ہے، یا کم از کم حلقۂ احباب سے باہر گمنام رہتا ہے۔

طاقتِ مغلیہ کے زوال اور تیمور کے عروج تک ایران کی پُرآشوب حالت

اِس نقطۂ نظر سے ایران انقراضِ مغلیہ کے بعد اور غلبہ تیمور سے قبل گشت آشنا شاعر کے لیئے بہترین میدان بن گیا تھا، شمال مشرق میں کرت شہزادوں کا دربار ہرات میں قایم تھا، سبزوار اور اُس کے نواح میں خاندان سربدار (اگر یہ خاندان اس لقب سے موسوم کیا جا سکتا ہے) حکومت کرتا تھا، خوانین ایل خانی یعنی شیخ حسن بزرگ، اِس کا بیٹا سلطان اویس اور اِس کے جانشین اُس عجیب وبیضوی سلطنت پر قابض تھے جس کا شمال پایتخت تبریز میں تھا اور جنوبی بغداد میں۔ ایران کا جنوب خاندانِ مظفریہ کے وارثوں میں تقسیم تھا جو اکثر ایک دوسرے سے آزاد اور کبھی برسرِ پیکار رہتے تھے، کسی کا مستقر شیراز تھا، کسی کا اصفہان تھا، کسی کا یزد اور کسی کا کرمان، یہ چھوٹی چھوٹی سیّال حکومتیں گھٹتی بڑھتی رہتی تھیں۔ آج ان کا رقبہ کچھ ہے تو کل کچھ، نقشہ ان کی حدود معیّن نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اس دور کا سیاسی جغرافیہ مرتّب کرنا چاہیں تو ہمیں سات یا آٹھ مرکز تصور کرنے چاہئیں جہاں سے اسی قدر جنگ جو اپنے اقتدار و اثر کی شعاعیں مختلف طاقتوں کے ساتھ ہر سمت میں پھیلاتے رہتے تھے۔ لیکن اکثر حالتوں میں ان کا مشغلۂ شمشیر ان کے پاکیزہ علمی ذوق کے ساتھ پرورش پاتا تھا۔

اِس دور کے شعرا کی قابلیت اور تعداد

اس دور کے سخن سنجوں میں کم از کم دس توجّہ کے مستحق ہیں، استحقاق کی بنا یا تو اُن کی مستند جدّت طرازی اور حسنِ کلام ہے یا اُن کی شہرت و وسعت نام جو اُن کو اپنے وطن میں حاصل ہے، شہرت و قابلیت اگرچہ عام طور پر لازم و ملزوم نہیں لیکن ہمارے نزدیک ان میں سے ہر چیز ایک شاعر کو مسند اعزاز کا حقدار بنا دیتی ہے، غیر ملکی ناقد کو چاہیئے کہ وہ اپنے فیصلوں کو ہرگز اٹل نہ سمجھے اور ہمیشہ یاد رکھے کہ باوجود کد و کاوش اُس کی نگاہ مذاق میں وہ موشگافی اور نزاکت شناسی نہیں پیدا ہو سکتی جو ایک ملکی ناقد کا خاص حصّہ ہے، محض یہ خیال کہ ایک شاعر نے اپنے ملک میں صدیوں تک اپنی شہرت کو سرنگوں نہ ہونے دیا اُس کو تعظیم و توجّہ کا مستحق کر دیتا ہے۔

اِس خصوصیت کا اطلاق خواجو، عماد کرمانی اور کمال خوجندی جیسے غزل سراؤں پر ہوتا ہی جن کی نسبت یہ دھوکا ہو سکتا ہی کہ وہ حافظِ بے عدیل کے ادنیٰ زلہ خوار ہیں اور جدت و تازگی سے ناآشنا لیکن امرِ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے پہلا حافظ سے ۳۰ اور دوسرا ۱۰ سال پیشتر مر چکا تھا اور کچھ بعید نہیں کہ دونوں نے حافظ کی پاکیزہ ترجمانیوں کے لیے غزل کا میدان صاف کر دیا ہو، رہا تیسرا جو حافظ کا معاصر تھا اُس کا پایہ خود حافظ نے ذیل کے شعر میں تسلیم کیا ہی:-

چوں غزلہائے تر و دلکشِ حافظ شنود ۔۔۔ گر کمالیش بود شعر نہ گوید بہ خجند

اِسی دور کے دوسرے شعرا مثلاً عبید زاکانی اور ابواسحاق نکات آفرینی و جدت طرازی میں اسقدر ید طولیٰ رکھتے ہیں کہ اُن کے ابنائے وطن نے خواہ اُن کو فہرست کمالات میں جگہ دی ہو یا نہ دی ہو لیکن ادبیات عجم کا محقق اِن کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ایرانی تذکرہ نویسوں کی غلط بیانی

لہٰذا اس باب میں ہم شعرائے ذیل پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں، تقدیم و تاخیر بیان کا انحصار یا تو اصل قابلیت پر ہوتا یا تاریخوں پر لیکن تاریخوں میں کامل صحت کا دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا، باعث یہ ہی کہ تذکروں میں اکثر شاعروں کی صرف تاریخ وفات مذکور رہی اور وہ بھی قیاس کی الجھنوں سے معرّا نہیں، اس کے سوا بہت سی حالتوں میں معلوم نہیں ہو سکتا کہ آیا ایک شاعر کس عمر میں فوت ہوا، صرف جوان ہو کر یا پوری عمر ہو کر۔ دولت شاہ، آتش کدہ، ہفت اقلیم اور اسی قبیل کی مشہور تالیفوں میں ورجنوں کاملین فن کے حالات زندگی اور اُن کے عادات و خصائل درج ہیں، لیکن نقص استناد سے قدم قدم پر ٹھوکر لگتی ہی اور محقق کی جان عذاب میں پھنس جاتی ہی، اِن تذکروں کے اکثر قصے پوچ و لچر ہوتے ہیں یا بے بنیاد اور فرضی، اشعار سے کہیں کہیں واقعات کا جھوٹ سچ کھل جاتا ہی لیکن پھر یہاں بھی ایک مشکل سامنے آجاتی ہی۔ دیوان و کلیات کی دو نقلیں آپس میں نہیں ملتیں، آخر ہار کر یہ کہنا پڑتا ہی کہ شعر گویان عجم کی نسبت ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ بہت کم ہی۔ یہ لوگ عموماً غریب و نادار ہوتے تھے، سوسائٹی میں ان کا نام گمنامی کا شکار رہتا تھا اور اس بنا پر مورخین معاصران کو قلم انداز کر دیتے تھے، بعد کی نسلیں جب ان کے جوہر کو پہچانتیں تو وہ عموماً اُن کے کلام کے بعض مشکل مقامات کو حل کرنے کی غرض سے کم و بیش معمولی قصے گھڑ کر اُن کے نام سے مشہور کر دیا کرتیں، تاہم

تاہم اس اعتراض سے ایک قلمی مگر نایاب نسخہ کو مستثنیٰ کر دینا چاہیے یعنی "مجملِ فصیحی خوانی کو جو تقریباً ایک ہزار صفحے کی ایک تاریخ ہی اور ۸۴۲ - ۸۴۵ھ / ۱۴۳۸ - ۱۴۴۱ء میں تالیف ہوئی تھی، اِس میں بہت سی قیمتی چیزیں ہیں جو کہیں میسّر نہیں آسکتیں، صوبہ خراسان کے حالات عموماً اور شہر ہرات کی سوانح خصوصاً قابل دید ہیں۔

دس شاعروں کا حال اس دور کے جن شعرا سے ہم بحث کرنی چاہتے ہیں وہ یہ ہیں[1]:-

(۱) ابنِ یمین (۲) خواجو کرمانی (۳) عبید زاکانی (۴) عماد کرمانی

(۵) سلمان ساوجی (۶) حافظ شیرازی (۷) کمال خوجند (۸) مغربی

(۹) ابو اسحٰق شیرازی (۱۰) محمود قاری

شمس الدین محمد حافظ اس دور کے شاعروں کی نسبت کم معلومات کے باب میں اوپر جو کچھ بیان ہو چکا ہی وہ ان میں بلکہ ایران کے تمام شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز اور سب سے زیادہ مشہور، غیر فانی اور رفقید الدہر حافظ شیرازی پر خصوصیت کے ساتھ منطبق ہوتا ہی، جس نے اپنے مداحوں کی زبان سے لسان الغیب اور ترجمان الاسرار کا خطاب حاصل کیا ہی۔ یہ قدرتی بات تھی کہ اِس کی وفات کے بعد دولت شاہ سے (جو حافظ کے سو برس بعد ہوا ہی) بالکل جدید زمانہ تک مجمع الفصحا اور ریاض العارفین میں اس کا ذکر آیا ہی لیکن ان میں حافظ کی تفصیلِ زندگی اعتبار کے لائق نہیں۔ حالات کا بڑا حصّہ قصّوں پر مشتمل ہی جو اُس کے بعض اشعار کے ساتھ مخلوط کر دیئے گئے ہیں اور سب نہیں تو اکثر قصّے اشعار کی تمثیل یا تشریح کی نیت سے وضع ہوئے ہیں، جہاں تک ہمیں معلوم ہی حافظ کا معاصرانہ ذکر اِس کے دوست اور جامع کلام محمد گل اندام کے دیباچہ میں پایا جاتا ہی۔ اس نے شاعر کی بے نظیر ذہانت اور عالمگیر ہمدردی کی تعریف کے بعد لکھا ہی کہ خواجہ کی نظم کا آوازہ خود اُس کی زندگی میں ہر طرف گونج اُٹھا تھا، نہ صرف ایران فارس سے خراسان و آذربایجان تک بلکہ ہند و ترکستان اور عراق عرب بھی اِس کے افکار پر سر دُھنتا تھا، گل اندام آگے چل کر بیان کرتا ہی:-

محمد گل اندام کا بیان "لیکن ہیں قرآن کی متواتر تلاوت، امور سلطانی کی مسلسل تعمیل، کشاف[2] و مصباح[3]

---

[1] ترجمہ کے لیے صرف حافظ کو انتخاب کیا گیا ہی، مترجم [2] مشہور تفسیر القرآن الزمخشری۔

[3] المسطرزی (متوفی ۶۱۰ - ۱۲۱۳) نے صرف و نحو عربی پر اس نام کی متعدد کتابیں لکھی ہیں، غالباً ان میں کسی تالیف سے مراد ہی۔

کی حاشیہ نویسی، مطالع و مفتاح کے مطالعہ، اُصول تنقید علمی کی تحصیل اور شعر عرب کی لطف اندوزی میں اسقدر مصروف رہتا تھا کہ حافظ کے غزل و اشعار کو جمع نہ کرسکا اور اُن کی ترتیب و تحشیہ سے عہدہ برآنہ ہو سکا۔ جس زمانہ میں حافظ آقائے نامدار اُستادِ یگانہ، روزگار محمد قوام الدین عبداللہ کے درس میں شریک ہوتے تھے تو میں اثنائے گفتگو میں ہمیشہ اور پے درپے اُن سے کہا کرتا تھا کہ وہ (حافظ) ان نادر جواہرات کو ایک لڑی میں پرو دیں اور ان چمکدار موتیوں کو ایک سلک میں جمع کردیں تاکہ وہ ان کے معاصرین کے لیے ایک گلوبند بیش بہا یا عروسان ہم عہد کے لیئے ایک کمر بند بن جائیں، مگر حافظ اس درخواست پر عمل پیرا نہ ہو سکے، عذر یہ تھا کہ شعراء معاصر قدر شناس نہیں ہیں، تا آنکہ اُنھوں نے ۷۹۱ ہجری (۱۳۸۹ء) میں اس زندگی کو خیر باد کہا . . . ."

حافظ کی سوانح عمریاں سر گور اوسلے کی دل پسند تالیف "تذکرہ شعراء ایرانؔ" میں اکثر وہ واقعے درج ہیں جو حافظ کے اشعار سے پیوند کر دیئے گئے ہیں اور جن کا حوالہ اوپر آچکا ہے، اِس کے زمانہ کے حالات اور اس کی شاعری کی خصوصیات پر مس جرٹ روٹ لوتھی اَن بیل نے اپنے معرکۃ الآرا کتاب "انتخاب دیوانِ حافظ" (مطبوعہ لندن ۱۸۹۷ء) میں بحث کی ہے۔ مس صاحبہ کی تالیف لیاقت و فراست، ذوق سلیم اور دقت نظر کا مجموعہ ہے، اس کے ذریعہ سے حافظ کا کلام انگریزی طبقے کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے، لیکن جہاں تک راقم الحروف کو معلوم ہے شبلی نعمانی کی اُردو تصنیف شعر العجمؔ میں حافظ کا تنقیدی مطالعہ جامعیت و خوبی کی آخری منزل تک پہنچا دیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیئے اس سے بہتر صورت نہیں کہ یہاں شعر العجم کے کم از کم اُس حصّہ کو جو شاعر کی زندگی سے متعلق ہے اور اُن چند واقعات کو جو اُس کے ذاتی حالات اور معاصرین کے تعلقات پر مشتمل ہیں اور جو اس کے اشعار سے اخذ کیئے جا سکتے ہیں، تلخیص کر کے ہدیۂ ناظرین کروں، ساتھ میں سوانح حافظ کے اُن عجمی ماخذوں کو بھی

۱؎ غالباً مطالع الانظار بیضوی (متوفی ۶۸۳ - ۱۲۸۴) سے مراد ہے۔ ۲؎ غالباً مفتاح العلوم مصنفہ السکّی (متوفی ۶۲۶ = ۱۲۲۹ء) مراد ہے۔ ۳؎ صفحہ ۲۳ - ۴۲

۴؎ جلد دوم صفحہ ۲۱۲ - ۲۹۷

بظاہر گردوں جن کی طرف علامہ موصوف نے شعرالعجم میں اشارہ کیا ہے، ماخذوں میں شبلی نے مشہور جیب السیر میخانہ[1] عبدالنبی فخرالزمانی (مؤلفہ ۱۰۳۶ = ۲۷ - ۱۶۲۶ء بعہد جہانگیری) کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے لیکن آخرالذکر کا کوئی نسخہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ فارسی تذکروں میں جن سے ہم نے استفادہ کیا ہے، معلومات کا بڑا توڑا ہے بقول شبلی، ایرانی تذکرہ نویس عموماً ایک دوسرے سے نقل کرتے چلے آئے ہیں اور اکثر حالتوں میں ایسے بیانات کو تسلیم کر لیتے ہیں جو نہ صرف معقول شہادتوں کے محتاج ہیں بلکہ باہمی تکذیب سے خود مسترد ہو جاتے ہیں، اس نوع کی تالیفات میں تذکرۃ الشعرا دولت شاہ ہے، بہارستان جامی، نفحات الانس، آتش کدۂ لطف علی بیگ جو تمام تر دولت شاہ سے ماخوذ ہے، ہفت اقلیم اور تازہ ترین مجمع الفصحا ہے جس میں چند نئی مگر مشتبہ باتیں اضافہ کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ خواجہ حافظ کا اصلی وطن تویسرکان تھا اور انھوں نے قرآن کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی۔

حافظ کا نسب اور بچپن شبلی نے اپنے مواد کو باقاعدگی سے ترتیب دیا ہے، حافظ کا ذکر ان کے نسب و تعلیم سے شروع کرتے ہیں ان کی تفصیل میخانہ بالا سے ماخوذ ہے، لیکن بظاہر وہ اس کتاب کو پایۂ اعتبار سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ حافظ کے والد ماجد بہاؤالدین نامی نے اتابکانِ فارس کے عہد میں ترک وطن کیا اور اصفہان سے شیراز آئے جہاں انھوں نے تجارت کے ذریعے سے بڑی دولت پیدا کی لیکن انتقال پر اپنے کاروبار کو ابتری اور بیوی بچہ کو مفلسی میں چھوڑتے گئے، حتیٰ کہ کم سن حافظ کو معاش کے لیے محنت و عرق ریزی پر مجبور ہونا پڑا، تاہم انھوں نے محلہ کے ایک مکتب میں تعلیم پانے کے لیے وقت اور خرچ کا انتظام کر لیا۔ یہاں معقول لیاقت پیدا کی اور قرآن مجید حفظ کر لیا، اسی نسبت سے انھوں نے بعد میں حافظ کا تخلص اختیار کیا، اصطلاح حافظ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اسلام کی مقدس کتاب کو حفظ کر لیتے ہیں اور اسے صحیح سنا سکتے ہیں، حافظ بہت جلد شعر کہنے لگے اور مشاعروں میں آنے جانے لگے، لیکن ابتداً انھیں کامیابی نہ ہوئی، آخر ایک شب شیراز کے شمال میں بابا کوہی کے مزار پر حاضر ہوئے اور شب بیداری کی تو امام علی کی زیارت سے مشرف ہوئے، امام نے ان کو ایک عجیب اور ربانی غذا کھلائی اور بشارت دی کہ جاؤ آج سے تم کمالات شاعری اور کلید علوم کے مالک ہو۔

---

[1] جلد سوم، حصہ دوم، صفحہ ۳، لیتھو ایڈیشن، مطبوعہ بمبئی ۱۸۵۵ء [2] صفحہ ۹ مطبوعہ قسطنطنیہ (۱۲۹۴ = ۷۷، ۱۸)

[3] مرتبہ نے سولیز، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۹ صفحہ ۱۵۰۔

حافظ کے ممدوح | اس کے بعد مولانا شبلی اُن سلاطین و اکابر کا ذکر کرتے ہیں جو حافظ کے مُربّی اور قدرداں تھے، ان میں پہلا شخص شاہ یا شیخ ابو اسحاق انجو تھا جس کا باپ محمود انجو[۱] غازانی خاں کے عہد میں فارس کا گورنر مقرر ہوا تھا، ابو اسحاق[۲] خود شاعر تھا اور شاعروں کا قدرداں تھا، مگر لاپروا، عیش پسند اور فرایض حکومت سے اس قدر غافل تھا کہ آخر میں مشکل سے جب اس کے مقرب خاص شیخ امین الدین نے شاہ مظفر کے لشکر پر جو پایۂ تخت کو محصور کیے پڑا ہوا تھا متوجہ کیا تو اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دشمن بڑا احمق ہے کہ بہار کے دلفریب موسم کی اس طرح تضیع کرتا ہے اور یہ شعر زبان پر لایا:-

بیا تا یک امشب تماشا کنیم　　چو فردا شود کار فردا کنیم

ابو اسحق کے مختصر لیکن فرحت انگیز عہد کی نسبت خواجہ صاحب کہتے ہیں:-

راستی خاتم فیروزۂ بواسحاقی　　خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود

دربار ابو اسحق کے پانچ ارباب کمال | ذیل کے اشعار جن میں ابو اسحق کے ارباب کمال کا ذکر قلمبند ہے اسی زمانہ کی تصنیف ہیں:-

بعہد سلطنتِ شاہ شیخ ابو اسحاق　　بہ پنج شخص عجب مُلک فارس بود آباد
نخست پادشہے ہمچو او ولایت بخش　　کہ گوئے فضل ربود او بعدل وبخشش وداد
دوم بقیۂ ابدال[۳] شیخ امین الدین　　کہ بود داخلِ اقطاب و مجمع اوتاد
سوم چو قاضیِ عادل اصیل ملت و دیں　　کہ قاضیِ بہ از و آسماں ندارد یاد
دگر چو قاضیِ فاضل عضد[۴] کہ در تصنیف　　بنائے شرح مواقف بنام شاہ نہاد
دگر کریم چو حاجی قوامِ دریا دل　　کہ او بجود چو حاتم ہمی صلا درداد

۱؎ فارس نامہ کے مطابق اریہ کے ہاتھ سے ۷۳۶ھ (۱۳۳۵-۳۶ء) میں قتل ہوا اور اریہ کو اس کے بیٹے مسعود انجو نے تہ تیغ کیا۔ ۲؎ فارس نامہ میں تحریر ہے کہ اس نے ۷۴۳ھ (۱۳۴۲-۴۳ء) میں شیراز فتح کیا اور یہیں ۷۵۳ھ (۱۳۵۲-۵۳ء) میں مبارز الدین محمد بن مظفر نے اس کو گھیر لیا، لیکن بچ کر نکل کے قتل پر اصفہان کی جانب پسپا ہوا اور بالآخر ۷۵۸ھ (۱۳۵۷ء) میں حرف کے ہاتھ سے گرفتار اور قتل ہوا۔ ۳؎ ابدال، اقطاب اور اوتاد رجال الغیب کے تین طبقے ہیں، صوفیہ کا عقیدہ ہے کہ یہ حضرات نظام عالم اور فلاح انسان کے حامل ہیں، اِن کی تعداد فرایض اور اختیارات کی نسبت شریف جرجانی نے "تعریفات" کی بحث میں صراحت کی ہے، شریف کو شاہ شجاع نے شیراز میں پروفیسری کے عہدہ پر مامور کیا تھا۔ یقین ہے کہ یہ حافظ سے واقف ہوگا، اس نے ۸۱۶ھ = ۱۴۱۳ء میں انتقال کیا۔ ۴؎ عضدالدین عبدالرحمن بن احمد الایجی نے مذہب، دینیات اور فلسفہ و اخلاق وغیرہ پر کئی تصانیف چھوڑی ہیں، اِن میں مواقف فی علم الکلام (شریف جرجانی: کو حاشیہ نمبر ۳ دیکھئے) اس کی ایک شرح لکھی ہے

(بقیہ صفحہ ۱۴۰ ملاحظہ ہو)

نظیرِ خویش نہ بگزاشتند و بگزشتند　　خدائے عزّوجل جملہ را بیامرزاد

مبارزالدین بن مظفر مبارزالدین محمد بن مظفر نے ۷۵۴ھ/۱۳۵۲ء سے ۷۵۹ھ/۱۳۵۷ء تک فارس پر حکومت کی لیکن وہ اپنے پیشرو سے مقتول عیش پسند ابو اسحاق سے بالکل مختلف تھا، مزاج پر گرمی اور سخت گیری مستولی تھی، شعار و احکام کی تعمیل رہبانیت کی سرحد سے ٹکراتی تھی، شیراز پر قابض ہوتے ہی اُس نے تمام میخانوں کو اُجاڑ دیا، اور حتی الامکان مےنوشی کا خاتمہ کر دیا، حافظ اِس ورع و احتساب سے جل کر خاک ہو گیا، چنانچہ اشعار میں ان بے رونق ایّام کا جابجا تذکرہ کیا ہی اور اشعارِ ذیل بھی اِس واقعہ کا نوحہ ہیں:-

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گُل بیزست　(۱)　ببانگِ چنگ مخور مے کہ محتسب تیزست
در آستینِ مرقع پیالہ پنہاں کُن　　کہ ہمچو چشمِ صراحی زمانہ خونریزست
ز رنگِ بادہ بشوئید خرقہا از اشک　　کہ موسمِ ورع و روزگارِ پرہیزست
بود آیا کہ درِ میکدہا بہ کشائید　(۲)　گرہ از کارِ فروبستۂ ما بکشائید
گیسوئے چنگ ببرّید بمرگِ مئے ناب　　تا ہمہ مغبچہا زلفِ دوتا بکشائید
نامۂ تعزیتِ دخترِ رز بنویسید　　تا حریفاں ہمہ خوں از مژہا بکشائید
درِ میخانہ ببستند خدایا مپسند　　کہ درِ خانۂ تزویر و ریا بکشائید
اگر از بہرِ دلِ زاہدِ خودبیں بستند　　دل قوی دار کہ از بہرِ خدا بکشائید

شاہِ شجاع میخانوں کی اجازت دیتا ہی شاہِ شجاع جب اپنے باپ مبارزالدین کا جانشیں ہوا تو اُس نے تمام قیود کو اُٹھا دیا، اس موقع پر ذیل کی رباعی اِسی کا نتیجۂ فکر ہی:-

---

(بقیہ نوٹ صفحہ ۷) سب سے بلند پایہ ہی ۷۵۶ھ/۱۳۳۵ء میں فوت ہوا، دیکھو براؤن "ادبیاتِ عرب" صفحہ ۲۰۸-۲۰۹ - ۵ خواجہ نے حاجی قوام کو متعدد اشعار میں یاد کیا ہی، ذیل کا شعر اس لحاظ سے بدرجۂ غایت مشہور ہی ۔ دریائے اخضرِ فلک و کشتیِ ہلال + ہستند غرقِ نعمتِ حاجی قوامِ ما۔ فارس نامہ میں حاجی موصوف کی تاریخ وفات ۷۵۳ھ/۱۳۵۲ء منقول ہی۔

[۱] یعنی تار [۲] اسلامی ممالک میں شراب کی تجارت یہودی، عیسائی یا زرتشتیوں کے ہاتھ میں ہوتی ہی، حافظ اور اُس کے ہمنوا اُس کے لیئے پیرِ مغاں (مجوسیوں کا سردار) اور مغبچہ (مجوسی بچہ) شراب خانوں کے عناصر لاینفک ہیں۔
[۳] یعنی شراب، عربوں کے ہاں بھی شراب اسی طرح بنت العنب کہلاتی ہی۔

در مجلسِ دہر سازِ مستی پست ست | نہ چنگ بقانون نہ دف بر دست ست
رنداں ہمہ ترکِ مے پرستی کردند | جز محتسبِ شہر کہ بے مے مست ست

حافظ نے بھی اماکنِ شراب کے دوبارہ افتتاح پر قہقہے لگائے ہیں:-

سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش | کہ دورِ شاہِ شجاع است مے دلیر بنوش
شد آں کہ اہلِ نظر برکنارہ می رفتند | ہزار گونہ سخن بر دہان ولب خاموش
ببانگِ چنگ بگوئیم آں حکایتہا | کہ از نہفتن آں دیگِ سینہ میزد جوش
رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند | گدائے گوشہ نشینے تو حافظا مخروش



قسم بحشمت وجاہ وجلالِ شاہِ شجاع | کہ نیست باکسم از بہرِ مال وجاہ نزاع
بہ بیں کہ رقص کناں میرود بنالۂ چنگ | کسے کہ اذن نمی داد استماعِ سماع
چنگ در غلغلہ آمد کہ کجا شد منکر | جام در قہقہہ آمد کہ کجا شد مناع
عمرِ خسرو طلب ار نفع جہاں مے طلبی | کہ وجود یست عطا بخش وکریمے نفاع
مظہرِ لطفِ ازل روشنیٔ چشمِ امل | جامعِ علم وعمل جانِ جہاں شاہِ شجاع

شاہِ شجاع کا خواہ مخواہ سے حسد اگرچہ حافظ نے اشعارِ بالا اور دیگر مقامات پر شاہ شجاع کی مدحت سرائی کی ہے لیکن کہتے ہیں کہ شہزادہ شاعر کی طرف سے دل میں بیر رکھتا تھا۔ شجاع کو کرمان کے ایک شاعر عماد فقیہ سے نہایت عقیدت تھی، اِس کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے ایک بلی کو نماز کی تعلیم دی تھی اور جس وقت بادشاہ رکوع وسجود ادا کرتا تو بلی بھی ہو بہو اس کی پیروی کرتی، بادشاہ اس کارنامہ کو اعجاز سے تعبیر کرتا تھا لیکن خواجہ اس کو مداری کا کھیل سمجھتا تھا، چنانچہ وہ اپنے خیال کو نظم کرتا ہے:-

صوفی بجلوہ آمد وآغازِ ناز کرد | بنیادِ مکر با فلکِ حقہ باز کرد
اے کبکِ خوش خرام کہ خوش میروی بناز | غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

لہ صفحات بالا ۴۳ اور ۵۰ میں اس تلمیح کا مفہوم بیان ہو چکا ہے Rosenweig-Schwannan کی ایڈیشن رجلد اوّل صفحہ ۲۱۶ نمبر

عماد کرمانی سے حافظ کی نفرت روایت ہے کہ عماد سے حافظ کا تنفّر شاہ شجاع کی خفگی کا اصلی سبب تھا لیکن میدان شاعری میں شجاع کی ہزیمتیں رنجش کا باعث مزید ثابت ہوئیں، ایک موقع پر اس تاجدار نے حافظ کے کلام پر تعدد مذاق تنوّع عنوان کا اعتراض کیا اور کہا کہ اس میں مقصد واحد کی بو نہیں، کہیں صوفیانہ ہے تو کہیں عاشقانہ، کہیں بادہ و جام کا شور ہے کہیں متانت و تورّع کا جوش، ایک شعر میں زبان رازی ہے، تو دوسرے میں دُنیا سازی، اور تیسرا اس سے بھی بدتر، حافظ نے جواب دیا "بجا ہے لیکن باوجود اس کے ہر شخص میرے اشعار سے واقف ہے، ان کی تعریف کرتا ہے اور لُطف لیکر پڑھتا ہے، بخلاف اس کے بعض شاعروں کا کلام (جن کو میں جانتا ہوں)، شہر کے دروازہ سے باہر نہیں جاتا۔" اِس جواب سے شاہ شجاع نہایت برہم ہوا۔ چند ہی روز بعد حافظ کے اِس شعر پر اس کی نظر پڑی اور بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ حافظ اس کے شکنجہ میں پھنس گیا اور اب اِس کی خیر نہیں ؎

گر مُسلمانی ہمیں ست کہ واعظ دارد
وائے گر از پسِ امروز بود فردائے

حافظ الزامِ کفر سے بچ نکلتا ہے احباب نے حافظ کو خبر دی کہ دربار میں اس شعر کو بدعت و کفر یا الحاد لاادریت کے جرم کے لیئے ڈھالا جا رہا ہے، یہ سُن کر خواجہ بہت پریشان ہوئے اور مولانا زین الدین ابوبکر تاٹبادی کے پاس گئے جو اتفاق سے اُس وقت شیراز میں فروکش تھے، اِن سے پوچھا آپ کیا صلاح دیتے ہیں، اُنھوں نے فرمایا شعر پر دوسرا شعر بڑھا دو تاکہ متنازعہ فیہ کسی دوسرے کی زبان کا معلوم ہونے لگے اور تم نقلِ کفر کفر نباشد کے دامن میں محفوظ ہو جاؤ، خواجہ صاحب نے برجستہ کہا:-

ایں حدیثم چہ خوش آمد کہ سحرگہ می گفت
بر درِ میکدہ با دف و نے ترسائے

اور جس وقت فردِ جرم الحاد اِن کے خلاف باضابطہ طور پر مرتب ہوئی تو اُنھوں نے یہ شعر دوسرے شعر کے ساتھ پیش کرکے عرض کیا کہ پہلا شعر ایک عیسائی کا ہے، اور میں عیسائی کی رائے کا ذمّہ دار نہیں۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۹، ردیف د) میں اِن اشعار کا متن شبلی کے متن سے کسی قدر مختلف ہے، ہم نے یہاں شبلی سے نقل کیا ہے۔

[1] یہ واقعہ حبیب السیر جلد سوم، حصّہ دوم، صفحہ ۳۷ وغیرہ میں منقول ہے۔

شاہِ منصور شاہِ شجاع نے ۷۸۵ھ/۱۳۸۳-۸۴ء یا ۷۸۶ ہجری میں قضا کی، اُس کی جگہ اُس کا بیٹا زین العابدین تخت پر بیٹھا، مگر زین العابدین کو اُس کے چچا زاد بھائی شاہ منصور نے ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں معزول و مقیّد کر دیا، حافظ نے آخر الذکر کی کامیابی کی مبارک باد میں ایک غزل لکھّی جس کا مطلع ہے

بیا کہ رایتِ منصور پادشاہ رسید
نویدِ فتح و ظفر تا بمہر و ماہ رسید

تیمور اور حافظ کی ملاقات زین العابدین نے جو بعد میں اندھا کر دیا گیا تھا، معزول ہونے سے قبل تیمور کی سیادت قبول کر لی تھی اور اِس کے سفیر قطب الدین کو اپنے دربار میں جگہ دے کر تاتار اعظم کا نام خطبے اور سکّوں میں داخل کر لیا تھا، خود امیر تیمور بھی زین العابدین کے عزل سے پہلے ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں شیراز آیا تھا، اگر تیمور اور حافظ کی ملاقات ایک افسانہ نہیں تو اِس کا موقع یقیناً یہی ہونا چاہیئے اگرچہ دولت شاہ اور اُس کے متبعین اس ملاقات کو ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء کا واقعہ بتاتے ہیں جب کہ تیمور دوسری مرتبہ شیراز میں داخل ہوا، لیکن اِس سن میں شاعر کو انتقال کئے تین یا چار سال گذر چکے تھے، ملاقات کا قصّہ جتنا مشہور ہے اُتنا مستند نہیں۔

دولت شاہ پہلی ملاقات کی تاریخ ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء لکھتا ہے اور پھر عجیب بے احتیاطی سے حافظ کا سال وفات ۷۹۴ھ/۱۳۹۲ء دیتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حافظ نے ۷۹۱ھ/۱۳۸۹ء میں انتقال کیا یا ممکن ہے کہ اِس کے ایک سال بعد، اوّل الذکر اعداد حافظ[2]، تاریخ لوحِ مزار سے اخذ ہوتے ہیں جس کو ہرمن بکنیل نے کمال ذہانت سے انگریزی میں ترجمہ[3] کیا ہے:۔

تاریخ

چراغِ اہلِ معنی خواجہ حافظ — کہ شمعِ بود از نورِ تجلّی
چو در خاکِ مصلّٰی ساخت منزل — بجو تاریخش از خاکِ مصلّٰی

Chronogram.

On spiritual man the lamp of Hafiz gleamed,
Mid rays from Glory's Light his brilliant taper
beamed ;

---

[1] موخر تاریخ ان الفاظ سے (حیف از شاہِ شجاع) نکلتی ہے جو مجمل فصیحی میں درج ہے۔ [2] دیکھو صفحہ ۲۰۵-۲۰۶ مرتبہ راقم
[3] دیکھو "حافظ شیرازی مترجمہ ہرمن بکنیل (ٹروبنر اینڈ کو، لنڈن ۱۸۷۵) صفحہ مقدمہ ۱۹

Musalla was his home : a mournful date to gain
Thrice take thou from Mosalla's Earth its richest grain.

اعداد خاکِ مصلیٰ کی میزان ۹۱، ہوتی ہے اور MLL = ۱۱۰۰ میں سے ااا = ۳۰۹) کو تفریق کیا جائے تو بھی یہی تاریخ نکل آتی ہے، جامع دیوانِ حافظ، محمد گل اندام نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے لیکن جامی نے نفحات الانس، خواند میر نے حبیب السیر اور فصیحی خوانی نے مجمل میں ۹۲، سال وفات درج کیا ہے[1]

زندگی میں شہرت

بیان ہو چکا ہے کہ حافظ کی شہرت خود اس کی زندگی میں ہر طرف پھیل گئی تھی، وہ خود بھی اس کا اشارہ کرتے ہیں :-

بشعرِ حافظِ شیرازی گویند و می رقصند
سیہ چشمانِ کشمیری و ترکان سمرقندی

ایک دوسرے مقام پر وہ اپنی ایک تازی غزل کے ذکر میں کہتے ہیں :-

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند — زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
طیِّ مکاں بہ بین و زمانِ رسلوکِ شعر — کیں طفلِ یک شبہ رہِ یک سالہ می رود

حافظ کے تعلقات صرف مظفریانِ شیراز تک ختم نہیں ہوتے بلکہ وہ دوسرے سلاطینِ معاصر سے بھی نامہ و پیام رکھتے تھے، سلطان احمد ابن اویس جلائر جو بغداد کا ایلخانی فرماں روا تھا اور فنونِ لطیفہ یعنی شاعری، موسیقی صناعی اور مصوری میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، بارہا حافظ کے سر ہوا کہ وہ بغداد تشریف لائیں اور اُس کے دربار کو زینت بخشیں، لیکن جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں :-

نمی دہند اجازت مرا بسیر و سفر — نسیمِ بادِ مصلیٰ و آبِ رکناباد

تاہم خواجہ نے اس شہزادہ کو اپنی تحسین سے محروم نہ کیا، اس کی مدح کے بعض اشعار یہاں نقل کرتے ہیں :-

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان — احمدِ شیخ اویسِ حسنِ ایلخانی

---

[1] تاریخ ادبیاتِ ایران "مؤلفہ راقم جلد دوم صفحہ ۲۰۰"
[2] مرتبہ Rosenweig-Schwannau جلد اوّل صفحہ ۱۶۴

خانِ بن خان و شہنشاہِ شہنشاہ نژاد آں کہ می زیبد اگر جانِ جہانش خوانی
از گلِ فارسیم غنچۂ عیشے نہ شگفت حبّذا دجلۂ بغداد و مئے رُوحانی
بر سخن کاکلِ ترکانہ کہ در طالعِ تست دولتِ خسروی و منصب چنگیز خانی

گو خواجہ کو بغداد کا سفر نصیب نہ ہوا لیکن سفر کی آرزو دل میں جاگزیں تھی:-

رہ نبردیم بمقصودِ خود اندر شیراز
خرّم آں روز کہ حافظ رہِ بغداد کند

ہندوستان کی طلبیاں

ہندوستان کے بھی دو مسند آراؤں نے خواجہ کو ہندوستان بلانے کی کوشش کی، اِن میں ایک تو دکن کا والی محمود شاہ بہمنی تھا جس کا دربار بُلبلانِ شعر کا ملجا و ماویٰ بنا ہوا تھا، اِس نے اپنے مقرّبِ خاص میر فضل اللہ کی وساطت سے حافظ کو ارضِ دکن کی دعوت دی اور سفر کے لیے خرچ بھیجا، حافظ نے اس رقم کا بڑا حصّہ شیراز میں نیگ لگا دیا اور خلیجِ فارس آتے ہوئے جس وقت لارین مقام کیا تو باقی کا روپیہ اپنے ایک مفلس دوست کی نذر کردیا، دو ایرانی سوداگر خواجہ زین الدین ہمدانی اور خواجہ محمّد کازرونی ہندوستان آرہے تھے، اُنھوں نے خواجہ کی لُطفِ صحبت کے بالعوض خواجہ کی کفالت کا تہیّہ کیا، خواجہ اُن کے ساتھ بندرگاہ ہرمز تک آئے جہاں ایک جہاز ہندوستان کے مسافروں کا انتظار کررہا تھا، لیکن اُن کے پہونچتے ہی سمندر میں طوفان آگیا اور خواجہ کے ہوش اُڑ گئے، حتّیٰ کہ اُنھوں نے اپنا ارادہ ترک کیا اور شیراز واپس لوٹ آئے، محمود شاہ کے پاس ایک غزل لکھ بھیجی جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:-

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد بمے بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمی ارزد
شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیمِ جاں درو درج است کلاہِ دلکش ست امّا بترکِ سر نمی ارزد
بکوئے می فروشانش بجامے در نمی گیرند زہے سجّادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد
بس آساں می نمود اوّل غمِ دریا ببوئے سود غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد

اِس غزل کا منظوم ترجمہ مس جرٹ روڈلو تھی ان بیل کی نفیس کتاب "انتخابِ دیوانِ حافظ" (نمبر ۲۱ صفحہ ۹۱-۹۳)

ؔ۱ یہ قصّہ ہندوستانی مورّخ محمّد قاسم فرشتہ استرآبادی سے ماخوذ ہے جو $\frac{1015}{1606-1607}$ میں موجود تھا۔ ؔ۲ لندن، ولیم ہینےمان

میں موجود ہی اگرچہ مترجمہ اشعار کی ترتیب، ترتیبِ بالا سے مختلف ہی۔

دوسرا ہندوستانی فرماں روا جس نے حافظ کو اپنے دربار میں طلب کیا سلطان غیاث الدین ابن سلطان سکندر والیِ بنگال تھا۔ شبلیؔ جن کی سند سے یہ قصہ نقل کیا جاتا ہی[1]، تحریر کرتے ہیں کہ غیاث الدین ۱۳۶۶ء-۷۶۸ھ میں تخت پر تمکّن ہوا اور اُس نے خواجہ صاحب سے خط و کتابت کی۔ ذیل کے تین اشعار اُس غزل میں وارد ہوئے ہیں جو اُس کے نام شیراز سے موصول ہوئی تھی:-

ساقی حدیثِ سرو و گل و لالہ میرود — وین بحث با ثلاثۂ غسالہ میرود

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند — زین قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطان غیاث دین — غافل مشو کہ کارِ تو از نالہ میرود

حافظ کے خانگی حالات

سلاطین کے ساتھ حافظ کے تعلقات بیان کرنے کے بعد اب ہم اُن حالات پر توجہ کرتے ہیں جو اُن کی خانگی زندگی سے علاقہ رکھتے ہیں اور جو تعداد میں بہت تھوڑے یا محض قیاسی ہیں، اس بات کا پورا ثبوت نہیں ملتا کہ خواجہ کو ایک کسی شاخ نبات سے عشق تھا جس کے ساتھ اُنھوں نے بعد میں عقد کر لیا تھا، عجمی تذکرہ نویس مناکحت کے معاملات پر عموماً قلم کو خاموش رکھتے ہیں، چنانچہ خواجہ کے اس معاملہ میں بھی ان کی طرف سے کسی تفصیل کی توقع نہیں کی جا سکتی، یہ کہ خواجہ نے شادی کی اور صاحبِ اولاد تھے، قرینِ قیاس ہی، بعض سوانح نویسوں کا خیال ہی کہ اُنھوں نے ایک غزل میں اپنی بیوی کی وفات کا صدمہ نظم کیا ہی جس کا مطلع ہی[2]:-

آں یار کز و خانۂ ما جائے پری بود

سرتا قدمش چوں پری از عیب بری بود

لیکن غزل میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جس سے بیوی کا ثبوت پیدا ہوتا ہو، تاہم اس سے زیادہ واضح اشارہ ذیل کے شعر میں ہی جو ایک بیٹے کی اوائل موت کی خبر دیتا ہی:-

---

[1] مولوی عبدالمقتدر کی معرکۃ الآرا "فہرست بانکی پور" (شعراءِ ایران: تا حافظ صفحہ ۲۵۳-۲۵۴) میں اس قصہ کا بادشاہ دہی شخص ہی جس کا نام اوپر آچکا ہی یعنی محمد شاہ بہمنی ان سے ۱۳۷۸ء-۱۳۹۶ء، ۷۸۰ھ سے ۷۹۹ھ تک حکومت کی یہاں قصہ کی شکل بدل گئی ہی اور اس میں تفصیل بھی زیادہ ہی۔

[2] مرتبہ Rosenweig-Schwannau جلد اوّل صفحہ ۵۹۶-۵۹۸ اور حاشیہ صفحہ ۸۱۹

دلا دیدی کہ آں فرزانہ فرزند | چہ دید اندر خم ایں طاقِ رنگیں
بجائے لوحِ سیمیں در کنارش | فلک بر سر نہادش لوحِ سنگیں

قطعۂ[۱] ذیل کی نسبت بھی عام خیال ہے کہ وہ مذکور الصدر یا کسی اور بیٹے کے رنج میں کہا گیا ہے، صدمہ کی تاریخ ۶ ربیع الاول ۷۶۴ھ (= ۲۴ دسمبر ۱۳۶۲ء) ہے:-

صباحِ جمعہ بد و سادسِ ربیعِ نخست | کہ از دلم رخِ آں ماہ روئے شد زائل
بسالِ ہفصد و شصت و چہار از ہجرت | چو آب گشت بمن حل حکایتِ مشکل
دریغ و درد و تاسف کجا دہد سودے | کنوں کہ عمر بازیچہ رفت بے حاصل

ایک تذکرہ کے مطابق، جس کا نام خزانۂ عامرہ ہے اور جس کو ۱۱۷۶ھ-۶۳-۱۷۶۲ء میں بلبلِ ہندوستان میر غلام علی آزاد نے مرتب کیا ہے، حافظ صاحب کا ایک بیٹا شاہ نعمان ہندوستان آیا اور برہان پور میں انتقال کے بعد اسیر گڈھ میں دفن کیا گیا۔

حافظ کا مبلغ علم

حافظ کی علمی قابلیت کے متعلق صرف اُن کے دو لسانی اشعار ہی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان کی معقول استعداد رکھتے تھے، محمد گل اندام کا بیان اس پر مستزاد ہے کہ خواجہ نے اس زبان میں ایک عالمانہ تصنیف چھوڑی ہے، خواجہ خود کہتے ہیں:-

زحافظانِ جہاں کس چو بندہ جمع نہ کرد
لطائفِ حکما با کتابِ قرآنی

حفظِ قرآن کا ثبوت اس شعر میں موجود ہے:-

ندیدم خوشتر از شعرِ تو حافظ
بقرآنے کہ اندر سینہ داری

صلوں کی خواہش

مولوی شبلی نعمانی متوجہ کرتے ہیں کہ لوگ خواجہ کو سلاطین و امرا کے عطیوں سے بے نیاز

[۱] سلیٹ کی شکل کوئی چیز جس پر بچے مشق و حساب کرتا ہے۔ [۲] یعنی قبر کا پتھر۔ [۳] مرتبہ Rosenweig-Schwannau جلد سوم صفحہ ۲۸۰۔
[۳] مرتبہ Rosenweig-Schwannau جلد سوم صفحہ ۲۸۰۔
[۴] صفحہ بالا ۲۷۲۔

بتاتے ہیں، مگر ان کے اشعار سے اِس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی، برخلاف اِس کے اکثر معاصر فرماں رواؤں کے ذکر میں مداحانہ اشعار موجود ہیں، شاہ شجاع، شیخ ابو اسحاق، سلطان محمود، شاہ منصور اور حاکمان یزد و ہرمز سب ان کے ممدوحوں میں تھے:-

شاہ ہرموزم ندید و بے سخن صد لطف کرد　　　شاہِ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد
کارِ شاہاں این چنیں باشد تو اے حافظ مرنج　　　داورِ روزی رساں توفیق و نصرت شاں دہاد

حاکمِ یزد کی بے توجہی کی شکایت وہ ایک اور مگر نہایت مشہور اور پاکیزہ غزل میں کرتے ہیں[۱]:-

عمرتاں باد و مراد اے ساقیانِ بزمِ جم[۲]　　　گرچہ جامِ ما نشد پُر مے بدورانِ شما
اے صبا با ساکنانِ شہرِ یزد از ما بگو　　　کاے سرِ حق ناشناساں گوئے چوگانِ شما
گرچہ دُوریم از بساطِ قرب ہمت دور نیست　　　بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

اِن اشعار کو ہرمن بک نیل نے انگریزی میں نظم کیا ہے[۳]:-

دوسرے شعراء سے حافظ کا فرق

خواجہ حافظ اور ایران کے دوسرے قصائد گو میں فرق ہے، شبلی نعمانی نے خوب کہا ہے کہ انوری، ظہیر فاریابی اور سلمان جیسے جلیل القدر شعرا کے برخلاف خواجہ صاحب ادنیٰ اور پاجیانہ طریق سے معاش نہیں پیدا کرتے تھے یا مدح سے کام نہ چلتا تو ہجو پر نہیں اُترتے تھے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ خواجہ شیراز پر جان دیتے تھے، رکنا باد کے چشمہ اور مصلّیٰ کے باغات کی تعریف سے اُنکی زبان نہیں تھکتی:-

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　　کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلا را

پھر کہتے ہیں:-

---

[۱] مرتبہ Rosenweig-Schwannau جلد اول صفحہ ۴۔
[۲] جم یا جمشید ایران کے سلاطین روایت میں سے ہے، اس کا عہد انتہا درجہ عظمت و جلال سے وابستہ کیا جاتا ہے، اُس کو ادستا اور گہا و توں کے یمہ کا مثنیٰ سمجھنا چاہیئے، "ساقیاں بزم جم" سے یزد کا بادشاہ اور اس کے درباری مراد ہیں۔
[۳] کتاب مذکور صفحہ ۶۔

فرق ست ز آب خضر کہ ظلمات جائے اوست[1]   تا آبِ ما کہ منبعش اللہ اکبر ست[2]

اگرچہ خواجہ صاحب بہار و گلاب، بلبل و شراب اور حُسن و شباب کے رموز میں سرشار رہتے تھے اور گاہ گاہ اُس جمالِ ازلی کے گیت بھی گاتے تھے جس کا عالم کی تمام حسین و مطلوب چیزیں ایک ہلکا سا پرتو ہیں۔ لیکن بعض وقت وہ اپنے قدر دان اربابِ فضل و تدبّر کو بھی یاد کرتے ہیں۔ ان میں سلاطین کبار کے علاوہ، جن کا بیان اوپر گزر چکا ہی، حاجی قوام تھے قوام الدین حسن تھے، خواجہ جلال الدین، شاہ یحیٰی نصرت الدین اور دوسرے حضرات شامل تھے نیز گو خواجہ صاحب نے مثنوی و مقطعات اور قصائد و رُباعیات میں بھی طبع آزمائی کی ہی۔ لیکن اُن کا خاص میدان غزل ہی جس میں اُن کی جولانی کو نظر لگتی ہی، اس کا اعتراف اُن کے بہت سے پس آمدوں نے بھی کیا ہی، صائب، سلیم اور عرفی[3] وغیرہ سب خواجہ کی تعریف کرتے آئے ہیں مگر سر گور اوسلے کی تعریف سب تعریفوں پر بھاری ہی، وہ لکھتا ہی

حافظ کی بلند پایگی پر سر گور اوسلے کی رائے

"حافظ کا اسلوبِ بیان صاف، بے تکلف اور یکساں ہی، ساتھ میں اس سے فضل و تبحر، پختہ علوم کی واقفیت اور اشیا کی باطنی و ظاہری حقیقت کا گہرا علم ظاہر ہوتا ہی لیکن ان سب چیزوں سے بڑھ کر اسلوب میں ایک قسم کی ایسی دل آویزی ادا پائی جاتی ہی جو کسی شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔"[4]

تاہم خواجہ کے متعلق بہترین تبصرہ وہ ہی جو مس جرٹرڈ لوتھی ان بیل نے کیا ہی، اس میں اصابت تنقید، ژرف نگاہی اور شاعر کے ساتھ ہمدردی پائی جاتی ہی، مس صاحبہ نے بغایت نکات آموز پیرایہ میں خواجہ کا ڈینٹے سے جو اُن کا ہم عہد تھا موازنہ کیا ہی۔ ڈینٹے کے کلام کی خصوصیات گنانے کے بعد وہ لکھتی ہیں[5]:-

موازنہ حافظ و ڈینٹے

"بخلاف اس کے خواجہ کی نظر میں اس زمانہ کی نظیریں (؟) ہیچ ہیں، اس کے زمانہ کی تاریخ اُس کو اس درجہ معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہی کہ وہ اس پر التفات نہیں کرتا، اس کی زندگی میں اس کا شہر جیسے ڈینٹے فلورنس کو، پانچ یا چھ بار محصور ہوا اور اتنی ہی بار تسخیر بلکہ اس سے بھی زیادہ حاکم آئے اتنا ہی محبوب سمجھتا تھا جتنا کہ ڈینٹے فلورنس کو،

[1] یعنی آبِ حیات جس کی متعلق خیال ہی کہ وہ ظلمات کے ملک میں موجود ہی، سکندر اعظم نے اسے تلاش کیا تھا مگر یہ ناکام رہا، اس کے ربانی رفیق و رہبر خضر (جو بعض اوقات الیاس بیان کیے جاتے ہیں) نے اس کو ڈھونڈھ نکالا، اسے پیا اور حیاتِ ابدی حاصل کی۔ [2] تنگ اللہ اکبر ایک تنگ سی وادی ہی، شمال سے آنے والا سیاح سب سے پہلے شیراز کو یہیں سے دیکھتا ہی، اس کی تصویر "ترجمہ حافظ از بکنیل، مقدمہ، صفحہ ۲۱ میں دیکھنی چاہیئے۔ [3] اشعار مدحت شعر العجم جلد دوم صفحہ ۲۲۲ میں منقول ہی۔ [4] شعر العجم صفحہ ۲۲۴۔ [5] تذکرۃ الشعرائے ایران" (لندن ۱۰۲۶) صفحہ ۲۳۔ [6] کتاب مذکور صفحہ ۵۸-۶۰۔

او رہ گئے، ایک فاتح نے اِس کو خون سے تر کیا، دوسرے نے عیش و نشاط سے بھرا، اور تیسرے نے زہد و رہبانیت کے شکنجہ میں کسا، حافظ نے سلاطین و امراء کو یکے بعد دیگرے عروج پر چڑھتے اور صحرا کی خاک آلود سطح پر گرنے والی برف کے مانند پستی میں آتے ہوئے دیکھا، افسوسناک انجام، وسیع جشن، سلطنتوں کا زوال، لڑائیوں کی جھنکار ان تمام چیزوں کو اُس نے دیکھا اور سنا ہوگا، لیکن اُن کی آواز بازگشت اُس کے اشعار میں کتنی ہے؟ تقریباً بالکل نہیں، زیادہ سے زیادہ ایک آدھ حوالہ جس کو حافظ کے فاضل شارح کسی سیاسی واقعہ سے منسوب کرتے ہیں، ایک آدھ مدّاحانہ آواز پہلے ایک بادشاہ کے لیئے، کسی فتح کی مبارکباد اور کسی تاجدار جرنیل کی شجاعت کا اعتراف لیکن صرف اتنا جو ایک خود دار درباری شاعر کے فرایض میں داخل تھا، اس سے زائد نہیں۔

مگر ہم میں سے بعض کا خیال ہوگا کہ حافظ کی بے التفاتی اس کے فلسفہ کو صرف ایک ایسی چیز سے متصف کر دیتی ہے جو ڈینٹے کے ہاں موجود نہیں ہے، (اس سے زائد کیا لیکن نہیں) اطالوی اپنے فلسفہ کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، عالم کی نسبت اُس کا وہی خیال ہے جو اُس کے زمانہ میں رائج تھا، جو چیز اُس کے لیئے اصل حقیقت تھی وہ آج ہم میں سے اکثروں کے لیئے ایک خوبصورت خیال یا ایک خوفناک تصوّر ہے، حافظ کی تصویر میں دُور دُور کے منظروں کا احاطہ ہے۔ اگرچہ قریب کا منظر اتنا نمایاں نہیں، معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس کی نگاہ تصوّر حیرت انگیز تیزی بصیرت سے آراستہ تھی، اُن اقالیم خیالات کے پار ہو گئی تھی جنھیں ہم کئی سو برس بعد کے لوگ آباد کرنے والے تھے، ہم خواجہ کو معاف کر سکتے ہیں کہ اُس نے اپنے زمانہ کی مجموعی حالت اور انفرادی زندگی کا خاکہ اس قدر دُھندلا چھوڑا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایسے عمیق خیالات گڑھنے میں مصروف ہے جیسے کہ یہ وصیت کہ:۔

"(حافظ کے سوا) دنیا میں کوئی گویا ایسا نہیں جس کی آواز پر رند و زاہد دونوں ناچنے لگیں"

مترجم

اصطلاحاتِ علمیہ

انجمنِ ترقی اُردو کی سالانہ رپورٹ میں تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے کہ مختلف علوم و فنون پر کم و بیش چھ ہزار اصطلاحات تیار ہو چکی ہیں۔ انجمن نے یہ کام سررشتۂ تالیف و ترجمہ (حیدر آباد دکن) کی امداد و اتحاد سے انجام دیا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ اصطلاحات کتاب کی صورت میں شایع کی جائیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالہ کے ذریعہ سے اہلِ ملک کے سامنے پیش کی جائیں تاکہ اہلِ ذوق و اہلِ علم کو اُن پر رائے دینے اور تنقید کرنے کا موقع ملے۔

مجھے اُمید ہے کہ جو حضرات اپنے اپنے فن میں ماہر اور بعض بعض علوم میں خاص مہارت اور بصیرت رکھتے ہیں وہ اِن اصطلاحات کو بنظرِ غور ملاحظہ فرمائینگے اور اگر اُن کی رائے میں کسی لفظ کے بدلنے کی ضرورت ہے تو اس سے مطلع فرمائینگے۔ اُن کی رائیں اِس رسالہ میں شایع کی جائینگی۔ اگر اہلِ علم نے ان الفاظ کو پسند کیا تو ہم بلا تامل موجودہ الفاظ نکال کر مجوّزہ الفاظ داخلِ لغت کر دینگے۔ اس مشورہ اور تنقید کے بعد یہ اصطلاحات کتاب کی صورت میں شایع ہونگی۔

عبدالحق

آنریری سکرٹری انجمنِ ترقی اُردو

Physics

English	اردو	English	اردو
A		Air pump	ہوا پمپ
Absolute	مطلق	Alcohol	غول
Acceleration	اسراع	Algebraic sum	الجبری مجموعہ
Acting force	قوتِ عاملہ	Aluminium	زاجیہ
Action	عمل	Amplitude	حیطۂ اہتزاز
Adhesion	چپک	Angle	زاویہ
Affinity	اِلف	Angle of oscillation	زاویۂ اہتزاز

Antimony	کحلیہ
Apex	راس
Apparatus	آلہ
Apparent time	ظاہر وقت
Archimedes	ارشمیدس
Area	رقبہ
Arm (of a lever)	بازو
Atmosphere	کرۂ ہوائی
Atom	جوہر
Average	اوسط
Axis	محور
Axis of absoissane	(محور) فصلہ
Axis ol ordinates	(محور) معین

B

Balloon	غبارہ
Barometer	بارپیما
Base	قاعدہ
Beaker	گلاس
Bending	خماؤ
Bisection	تنصیف
Block (of a pulley)	بُلاق
Breadth	عرض
Brittle	پھوٹک
Buoyancy	اُچھال
Burette	ظرفک
Buruer	مشعل

C

Calibration	تعبیر
Calipers	چاپ
Capacity	گنجایش
Capillarity	قوت شعری
Capallary action	عمل شعری
Capillary tube	شعری نلی
Centi	سنتی
Centigrade scale	پیمانۂ سنتی
Centimetre (e. m.)	سنتی میتر (سم)
Centre	مرکز
Centre of Gravity	مرکز جاذبہ
Chalk	کھریا
Change	تغیر۔ تبدیلی
Chemical action	کیمیائی عمل
Circle	دائرہ

Circumference	محیط
Circumscribing cylinder	پیرامونی اُستوانہ
Cistern barometer	حوضکدار بارپیمانہ
Clamp	شکنجہ
Clip	چٹکی
Cohesion	اتصال
Collision	تصادم
Common Point	نقطۂ مشترک
Common pump	معمولی پمپ۔ دمکلا
Components of force	قوتوں کے اجزائے ترکیبی
Composition (of velocities or forces)	ترکیب
Compound	مرکب
Compressibility	بچکاؤ
Concave	مقعر
Condensation	تکثیف۔ بستگی
Cone	مخروط
Conservation of energy	بقائے توانائی
Constant	مستقل
Contact	تماس
Convex	محدب
Cork-squeezer	کاگ بھینچنے کا آلہ
Cross section	تراشِ عمودی
Crucible	کٹھالی
Crystal	قلم
Cube	مکعب
Curvature	انحنار
Curve	منحنی
Curved line	خطِ منحنی
Cylinder (jar)	اُستوانی
Cylinder (in Geometry)	استوانہ

D

Deca	دکا
Deci	دسی
Decimal	اعشاریہ
Degree	درجہ
Dense	کثیف
Density	کثافت (مطلق)
Depth	عمق (گہرائی)
Diagonal	وتر
Diameter	قُطر
Dimension	بُعد
Direction	سمت

English	Urdu
Disc	قرص
Displacement	ہٹاؤ
Distillation	کشید
Distilling flask	کشیدگی صراحی
Divisibility	انقسام
Ductile	متمدّد
Ductility	تمدّد
Dynamics	علم حرکات
Dyne	ڈائیں

E

English	Urdu
Efficiency	استعداد
Elasticity	لچک
Electric current	برقی رَو
Electricity	برق
Element	عنصر یا بسیط
Energy	توانائی
Equality / Equation	مساوات
Equator	خطِ استوا
Equilibrant	متعادل
Equilibrium	تعادل
Evaporation	تبخیر
Expansion	پھیلاؤ
Extension	کھنچاؤ
External calipers	بروں چاپ

F

English	Urdu
Figure	شکل
File	ریتی
Filter-paper	تقطیری کاغذ
Filteration	تقطیر ۔ چھاننا
Fixed pully	ثابت چرخی
Flask	صراحی
Fluid	سیال
Fluid pressure	سیالی دباؤ
Foot pound	فٹ پونڈ
Foot poundal	فٹ پونڈل
Force	قوت
Forceps	چمٹی
Forcing pump or force pump	داب پمپ
Four sided figure	ذو اربعۃ الاضلاع
Friction	رگڑ
Fulcrum	نصاب
Fundamental quantities	بنیادی مقداریں

G

English	Urdu
Gallon	گیلن
Gas	گیس
Geometric centre	مرکزِ ہندسی
Geometrical solids	مجسّماتِ ہندسی
Geometry	ہندسہ
Glycerin	گلسرین
Graduation	درجہ بندی
Gram	گرام
Graph	ترسیم
Graphite (Plumbage)	سرمان
Gravitation	تجاذب
Gravitational units	تجاذبی اکائیاں
Gravity	جاذبہ
Groove	نالی

H

English	Urdu
Hardness	سختی
Heat	حرارت
Hecto	ہکٹو
Height	ارتفاع
Hemisphere	نصف کرہ
Hexagon	مسدس
Hollow	مجوف۔کھوکھلا
Hook	ہُک
Horizontal	افقی
Horse-power	اسپی طاقت
Hour	ساعت۔ گھنٹہ
Hydraulic press	شکنجۂ آبی
Hydrogen	حمضین
Hydrometer	مائع پیما
Hydrostatics	علمِ سکونِ سیالات

English	Urdu
Ice	یخ
Impure	غیرخالص
Inclination	میلان
Inclined plane	سطحِ مائل
Index	نمائندہ
Inertia	جمود
Internal calipers	درون چاپ
Inverse proportion	معکوس تناسب
Iodine	بنفشین
Irregula	غیر منتظم

Isosceles triangle	مثلث مساوی الساقین

J

Jaw	جبڑا

K

Killo—	کلو
Kinetic energy	توانائی بالفعل

L

Laboratory	معمل
Law	کلیہ
Lead	سیسا
Length	طول
Lever	بیرم
Light	نور
Like parallel forces	موافق قوائے متوازی
Limiting friction	انتہائی رگڑ
Limit of elasticity	لچک کی انتہا
Line	خط
Line of action	خطِ عمل
Linear motion	حرکتِ مستقیم
Liquid	مایع
Litre	لیتر

M

Machine	مشین
Magnet	مقناطیس
Malleability	تورّق
Malleable	متورّق
Magnetic attraction	مقناطیسی کشش
Magnetisation	مقناطیسیت
Manometer	فشار پیما
Many sided figure	کثیر الاضلاع
Mass	کمیتِ مادہ
Matter	مادہ
Maximum value	قیمتِ اعظم
Mean solar day	اوسط روزِ شمسی
Mean time	اوسط وقت
Mechanical advantage	مفادِ حیلی
Mechanical equivalent	معادلِ حیلی
Mechanics	علم حیل
Meniscus	ہلالی سطح
Mercurial barometer	سیمابی بار پیما
Mercury	پارا
Metric system	میتری نظام

Micrometer screw-gauge	خردہ پیماپیچ
Microscope	خردبین
Milli	ملی
Millimetre (m m)	ملی میتر (مم)
Minerals	معدنیات
Minute	دقیقہ
Mixture	آمیزہ
Mobile	سریع السیلان
Molecule	سالمہ
Moment (of a force)	قوت کا معیار حرکت
Momentum	حرکت کا معیار اثر
Motion	حرکت
Motion in a curve	حرکت مستدیر، حرکت منحنی
Movable pulley	متحرک چرخی
Multiple	ضعف

N

Negative	منفی
Neutral Equilibrium	تعادل تعدیلی
Nitre	شورہ
Normal (Pressure, etc.)	طبعی (دباؤ وغیرہ)
Nut-cracker	سروتہ

O

Origin	مبداء
Oscillation	اہتزاز
Oxygen	مائیں

P

Pan	پلڑا
Parallax	اختلاف منظر
Parallelepiped	مجسم متوازی السطوح
Parallel forces	متوازی قوتیں
Parallelogram	متوازی الاضلاع
Particle	ذرّہ
Pendulum	رقّاص
Perfectly elastic	کامل لچکدار
Perfect machine	کامل مشین
Perimeter	گھیر
Perpendicular	عمود
Physical	طبیعی
Physics	طبیعیات
Pint	پائنٹ
Pipette	نالچہ
Piston	فشارہ

Pitch (of a screw)	گہائی
Plain surface	سطحِ مستوی
Platinum	نقریہ
Plumb line	شاقول
Pointer	نمائندہ
Point of action	نقطۂ عمل
Point of intersection	نقطۂ تقاطع
Pole	قطب
Polygon of forces	قوتوں کا کثیر الاضلاع
Porosity	تخلخل
Porous	متخلخل
Positive	مثبت
Potiential energy	توانائی بالقوہ
Poundal	پونڈل
Powder	سفوف
Pressure	دباؤ
Principle	اصول
Prism	منشور
Product	حاصل ضرب
Property	خاصیت
Proportion	تناسب
Protector	گونیہ
Pulley	چرخی
Pump	پمپ
Pure	خالص
Pyramid	مینار

Q

Quantity	مقدار

R

Radius	نصف قطر
Rare	لطیف
Rate	شرح
Ratio	نسبت
Re-action	ردِّ عمل
Rebound	واجستگی
Rectangle	مستطیل
Regular	منتظم
Relation (as in relative motion)	اضافت
Relative density	کثافت اضافی
Resin	بیروزہ
Resistence	حرکتِ اضافی
Resisting force	مزاحمت

Resolution (of force etc.)	قوتِ مزاحم
Resultant	تحلیلِ قوائے
Retardation	حاصل
Rhombus	ابطاء
Right angled triangle	مُعین
Rigid	مثلث قائم الزاویہ
Rigid scale	اُستوار پیمانہ
Rigidity	اُستواری
Ring	حلقہ
Rod	سلاخ
Rotation	گردشِ محوری

S

Scale	پیمانہ
Screw	پیچ
Screw-gauge	پیچ دار پیمانہ
Second	ثانیہ
Section	تراش
Shaft	دھری
Shell	خول
Side	ضلع
Sidereal day	روزِ فلکی
Similar triangles	متشابہ مثلث
Simple pendulum	سادہ رقّاص
Sine	جیب (جیب)
Siphon	سیفن یا خمدار نلی
Slant height	ارتفاعِ مائل
Sliding calipers	سرل چاپ
Slope	ڈھلوان
Smooth	چکنا۔ املس
Smoothness	چکنائی۔ ملاست
Snow	برف
Soft	ملائم
Solar day	روزِ شمسی
Solid	ٹھوس
Solution	محلول
Space	فضاء
Specific gravity	وزنِ نوعی
Speed	چال
Sphere	کرہ
Spherometer	کرویت پیما
Spirit (of wine)	روحِ شراب
Spring-balance	کمانی دار ترازو

Square	مربّع
Squared paper	مُربعدار کاغذ
Square root	جذر
Stability	قیام
Stable equilibrium	تعادلِ قایم
Stand	ٹیکن
Standard	معیار
State	حالت
Steam	بھاپ
Steelyard	ٹک
Stopper	ڈاٹ
Stop watch	چلرکنی گھڑی
Straight line	خطِ مستقیم
Stretch	کھنچاؤ
Sublimation	صعود تصعید
Sulphuric acid	گندک کا تیزاب (بازاری نام)
Support (in balance)	مسند۔ بیٹھک
Surface	سطح
Surface tension	سطح کا تناؤ
Swing	جھونٹا
Symmetry	سڈولپن
Syringe	پچکاری
System	نظام
System of pulleys	چرخیوں کا نظام

T

Tangent	خطِ مماس
Temperature	تپش
Tenacious	لوچدار
Tenacity	لوچ
Tension	تناؤ
Theory	نظریہ
Thermometer	تپش پیما
Thread (of a screw)	چوڑی
Three dimensions	ابعادِ ثلاثہ
Time-period	وقتِ دوران
Tin	قلعی
Toricellian Vacuum	خلائے طریسلی
Torsion	مروڑ
Total pressure	مجموعی دباؤ
Transformation of energy	توانائی کا استحالہ
Transit	مرور
Trapezium	منحرف

Triangle مثلث

Triangle of forces قوتوں کا مثلث

Tripod تپائی

Turpentine تاربین

U

Uniform ہموار

Unlike parallel forces. مخالف قوائے متوازی

Unit اکائی

Unstable equilibrium تعادلِ غیر قایم

U-tube لانمانلی

V

Vacuum خلا

Valve کھلمندن

Variable متغیر

Velocity رفتار

Velocity ratio رفتاری نسبت

Vernier کسر پیما

Vertex راس

Vertical line عمودی خط

Vibration ارتعاش

Viscosity لزوجت

Viscous لزج

Visible motion حرکت مرئی

Volume حجم

W

Wedge فانہ

Wedge gauge فانہ نما پیما

Weight وزن یا ثقل

Wheel and axle چرخ و محور

Wheel barometer چرخی دار بار پیما

Wind-mill پون چکی

Work کام

Z

Zone منطقہ

جامعۂ عثمانیہ (حیدرآباد، دکن)

یعنی

اُردو یونیورسٹی

ہندوستان میں آج کل یونیورسٹیوں کا دور ہی۔ میسور یونیورسٹی کئی سال ہوئے بن چکی۔ ہندو یونیورسٹی
بنارس کو بھی قایم ہوئی چار سال ہوتے ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی بن گئی۔ پٹنہ یونیورسٹی کا وجود میں آنا مسلّم اور یقینی ہی
مُسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا بل مجلس وضع قوانین میں پاس ہو چکا ہی۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لفٹنٹ گورنر لکھنؤ
میں یونیورسٹی قایم کرنے کا ڈول ڈال رہے ہیں۔ اور کوئی دن جاتا ہے کہ دہلی، ناگپور اور رنگون میں بھی یونیورسٹیاں
قایم ہو جائیں گی۔ یہ سب کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی برکت ہی۔

لیکن ان سب سے نرالی ایک اور یونیورسٹی ہی جو حیدرآباد دکن میں قایم ہوئی ہے اور جس نے اب دوسرے
سال میں قدم رکھا ہی۔

تعلیم کا مسئلہ ہندوستان میں ہر روز زیادہ نازک اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہی۔ اگرچہ علم کے لئے قوم و ملت،
گورے کالے، آب و ہوا کا کوئی امتیاز نہیں، لیکن کسی ملک کے باشندوں کو قابل اور مفید بنانے کے لئے ان تمام
امور کا لحاظ ضروری ہی۔ اب ایک مدت کے بعد ہم میں یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ جس ڈھنگ پر ہماری تعلیم جاری
ہی وہ ہمیں بہتر انسان بنانے کے لئے کافی نہیں وہ دنیاوی جد و جہد میں ہمارے زیادہ کام نہیں آتی وہ ہمارے
اخلاق و خصائل کی اصلاح میں کچھ بہت مفید ثابت نہیں ہوئی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی
ہمہ داں و ہیچمداں تعلیم ہمارے حالات کے مناسب نہیں اور نہ غالباً یہ ہمارے لئے وضع کی گئی ہی۔ جن اغراض
کو مدِ نظر رکھکر یہ طریقہ رائج کیا گیا تھا، گو اس کا تعلق بظاہر ہم سے معلوم ہوتا ہی۔ لیکن حقیقت میں ان کا منشا کچھ اور

تھا۔ اس سے انکار نہیں کہ موجودہ طریقۂ تعلیم سے ہمیں فائدہ پہنچا ہے مگر وہ فائدہ سرسری، اوپری اور ضمنی تھا۔ ابتدا
ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا انگریزی تعلیم کے جاری کرنے سے ایک مقصد یہ تھا کہ سستے محرر اور ماتحت عہدہ دار
آسانی سے بہم پہنچیں گے اور اُن کی عظیم الشان تعمیر میں قُلی کا کام دیں گے۔ لیکن بعد کے انگریز مدبّروں کی نظر
اس سے بھی دُور پہنچی اور انھوں نے اپنی تعلیمی پالیسی کی بنیاد ایک ایسی مصلحت پر رکھی جس کا سمجھنا اُس وقت ہمارے
وہم و گمان سے بھی پرے تھا۔ اس کا اعادہ انھوں نے بارہا اپنی تحریروں میں کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کی
اس دُور اندیشی، ذہانت اور فراست کی داد دینی پڑتی ہے۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ ہندوستانی انگریزی پڑھکر انگریزی
طرزِ رہائش، معاشرت اور تمدن اختیار کریں گے اور انگریزی مصنوعات کے دلدادہ ہوجائیں گے۔ اُن کا یہ خیال بالکل
صحیح نکلا۔ وہ ایک ایک چیز میں غیروں کے محتاج اور دست نگر ہیں۔

عیسائی مشنریوں نے بھی اس تعلیم کی اشاعت میں بہت کوشش کی اور اُن کی اس سعی سے ملک کو ایک گونہ
فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن ان کا مقصد بھی دوسرا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی انگریزی پڑھکر سب عیسائی ہوجائیں گے
ان کی رائے میں اہلِ ہند کی اخلاقی اور روحانی تعلیم مٹی کا ایک گھروندا تھی کہ پانی پڑتے ہی گھُل کر بہ جائے گا
مشنریوں کو اپنے اس قیاس میں بہت دھوکا ہوا اور اُن کی مُراد خاطر خواہ بر نہ آئی۔

لیکن انگریز مُدبّرین کا قیاس بالکل صحیح تھا اور حرف بحرف پُورا نکلا۔ ہمارے طریقۂ تعلیم پر غلامی کا داغ جو
ابتدا سے لگا ہے وہ اب تک نہیں مٹا۔ افریقہ کے غلاموں کی طرح جنھیں دُنیا میں سوائے غلامی کے دوسرا طریقہ
رہنے سہنے کا نہیں آتا تھا ہم بھی مُروجہ طریقہ کو جو سالہا سال سے چلا آتا ہے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ عادت
ایسی بُری چیز ہے کہ سمجھنے پر بھی نہیں چھوٹتی۔ بے بسی کی یہ نوبت ہے کہ اسے بدلنے یا چھوڑنے کے خیال کے ساتھ
یہ فکر ہوتی ہے کہ اگر اسے چھوڑ دیا تو پھر کیا کریں گے۔

ہماری قدیم تعلیم سراسر قومی، مذہبی اخلاقی اور مُلکی تھی۔ آج یہ حالت ہے کہ ہم **قومی تعلیم** کے لفظ کو ایک
نئی چیز سمجھتے ہیں اور اہلِ ملک کو اس کا مفہوم سمجھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نیرنگیٔ زمانہ کی یہ مثال قابلِ
غور ہے۔

قومی تعلیم کا پہلا اور ابتدائی اصول یہ ہے کہ تعلیم اپنی زبان کے ذریعہ سے دی جائے۔ یہ ایسا سیدھا سادہ

اور فطری اصول ہے کہ اگر کسی غیر ملک والے سے کہیں تو وہ ہنسنے گا اور کہے گا کہ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے کسی سے کہیں کہ پاؤں سے چلنا چاہیئے اور آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے۔ لیکن ایک ہماری ملک والے ہیں کہ اُن سے کہنے ہی کی نہیں بلکہ سمجھانے اور مباحثہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس پر بھی بہت سے ایسے ہیں جنھیں اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہے اور متذبذب ہیں۔

ہمارے نظام تعلیم میں دیسی زبانوں کا کیا حصّہ رہا ہے اور ان زبانوں کی ترقی کے کیا وسائل اختیار کئے گئے۔ یہ ایک ایسا دلچسپ اور قابل بحث مضمون ہے کہ اس کے لئے ایک جداگانہ کتاب کی ضرورت ہے لیکن یہاں ہم اس پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں۔

ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کبھی اس کا خیال نہیں کیا کہ اس ملک میں مغربی یا انگریزی طریقۂ تعلیم رائج کرے۔ اور ایسے خیال کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ کیوں کہ خود انگلستان میں جو تعلیم اس وقت رائج تھی وہ ہمارے ہاں کی تعلیم سے کچھ مختلف نہ تھی۔ وہاں بھی ہمارے مدارس کی طرح السنۂ قدیم اور دینیات کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا اور سائنس کو وہ قوت اور حکومت حاصل نہ ہوئی تھی جو اس وقت ہے۔ اس لئے اگر مدبران کمپنی کوئی تغیر و تبدل بھی کرتے تو کیا کرتے۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز جو ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا بانی ہوا ہے اور جسے اُس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں وہ قوت و اقتدار حاصل تھا جو ایک بادشاہ کو ہوتا ہے۔ ہندوستان کی السنۂ قدیم و قوانین کا بڑا قدر دان تھا۔ اس نے ۱۷۸۱ء میں عربی تعلیم کا ایک مدرسہ قایم کیا جو اب تک کلکتہ مدرسہ (مدرسۂ عالیہ کلکتہ) کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۷۹۱ء میں بنارس میں سنسکرت کالج قایم ہوا۔ سب سے اوّل چارلس گرانٹ نے جو ہندوستان میں رہ چکا تھا اور کمپنی کے ڈائرکٹروں میں سے تھا، انگریزی تعلیم کی اشاعت پر زور دیا۔ اس کا یہ خیال مشنریوں کی نئی تحریک کا نتیجہ تھا۔ لیکن کمپنی نے اس پر کوئی توجہ نہ کی۔ اور اس کے مدبرین اپنے قدیم خیال پر قایم تھے۔ ۱۸۱۳ء کے ایکٹ میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان کی تعلیم پر ایک لاکھ روپیہ صرف کیا جائے لیکن اس کے معنی وہ ہمیشہ یہی لیتے رہے کہ یہ رقم مشرقی تعلیم کے لئے مخصوص ہے۔ گورنمنٹ نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ البتہ ۱۸۲۳ء میں ایک مجلس تعلیمات (کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن) قایم ہوئی تو اس نے یہ رقم مختلف مدارس اور انجمنوں کی امداد میں صرف کی۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی تعلیم کے متعلق اختلاف رائے پیدا ہوا۔ اس میں دو گروہ ہو گئے۔ ایک مشرقی دوسرا مغربی۔ ایک کا خیال یہ تھا کہ اہل ہند کو مشرقی طرز کی تعلیم دی جائے اور دوسرے کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان میں انگریزی طریقۂ تعلیم رائج کیا جائے۔ ایک مدت تک مشرقیوں کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن آخر ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی آتش بیانی اور فصاحت نے اس جھگڑے کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیا۔ مغربی کامیاب ہوئے اور گورنمنٹ نے اس اصول کو اختیار کیا اور یہ طے کر دیا کہ آیندہ تمام تعلیمی رقوم اُن مدارس اور کالجوں پر صرف کی جائیں گی جن میں مغربی تعلیم دی جاتی ہے۔

اس کے دوسرے سال ہی فارسی سرکاری دفاتر سے خارج کر دی گئی اور اس کی جگہ انگریزی اور اُردو کو دی گئی۔

۱۸۳۵ء کے فیصلہ نے یہ بھی طے کر دیا کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو گی۔ سنسکرت یا عربی نہیں ہو سکتی اور اب تک اسی فیصلہ پر عملدرآمد چلا آ رہا ہے۔ اگرچہ عربی یا سنسکرت کو بھی ذریعہ تعلیم قرار دینا چنداں مفید نہ تھا لیکن اس سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ آگے چل کر بجائے عربی یا سنسکرت کے دیسی زبانیں ذریعہ تعلیم ہو جائیں گی۔ لیکن انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے دیسی زبانوں کے لئے کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ یہ فیصلہ درحقیقت ہماری زبانوں کے لئے موت کا فتویٰ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۳۵ء میں جو تعلیمی پالیسی قرار پائی اس میں ضمنی طور سے دیسی زبانوں کی ترقی کی بھی ترغیب دی گئی ہے۔ اور خود لارڈ میکالے نے بھی اپنی یادداشت میں ان غریب زبانوں کے حال پر نظر عنایت فرمائی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ۱۸۵۴ء کے مشہور ڈسپیچ میں بھی جس نے ہندوستان میں موجودہ طریقۂ تعلیم کی بنیاد ڈالی اور ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم کا زبردست خاکہ کھینچا ہے، دیسی زبانوں کی تعلیم و ترقی کا ذکر آیا ہے اور انگریزی کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کی تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ لیکن یہ تمام نصیحتیں اور ہدایتیں اور احکام جو غالباً اور یقیناً نیک نیتی اور دانشمندی پر مبنی تھے کبھی عمل میں نہ آئے۔ اور دیسی زبانیں اب تک بڑی سسک رہی اور بیچارگی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔

حال میں کلکتہ یونیورسٹی کی اصلاح اور اس کی تعلیم پر غور کرنے کے لئے ایک کمیشن کا تعین کیا گیا جس کے ارکان

ناموری ماہرانِ تعلیم تھے۔ اگرچہ اس کا تعلق کلکتہ یونیورسٹی سے تھا لیکن انھوں نے ہندوستان کے موجودہ طریقۂ تعلیم پر ایک وسیع نظر ڈالی ہی اور بہت سے ایسے امور جن کا تعلق صرف کلکتہ یونیورسٹی سے ہی دوسرے یونیورسٹیوں سے بھی متعلق ہوسکتے ہیں۔ اس کمیشن نے تعلیم کے ہر پہلو کو بڑے غائر نظر سے دیکھا ہے اور اُن کا کام ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہی گا۔ انھوں نے ذریعہ تعلیم اور دیسی زبانوں سے بھی بحث کی ہی۔ ہندوستان کے اہل الرائے کی شہادتیں جمع کی ہیں۔ ذریعہ تعلیم کے متعلق اختلاف رائے ہی۔ لیکن دیسی زبان کی تعلیم و ترقی کو عام طور پر سب تسلیم کرتے ہیں۔ ارکان کمیشن بعد غور و فکر کے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

۱:- ان کی رائے میں انگریزی کو ذریعۂ تعلیم ضرورت سے زیادہ بنایا گیا ہے اور دیسی زبانوں کی طرف سے سخت غفلت کی گئی ہی۔

۲- ہائی اسکولوں میں سوائے انگریزی اور ریاضیات کے دوسرے مضامین دیسی زبان کے ذریعہ سے سکھائے جائیں اور ذریعۂ تعلیم کے بارے میں طلبہ کو کامل اختیار دیا جائے۔

۳- تعلیم یونیورسٹی میں ماسوائے قدیم السنہ (سنسکرت، عربی، فارسی) اور دیسی زبانوں کے باقی تمام مضامین کی تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ سے دی جائے۔

یہ بہت غنیمت ہی اور اب ہماری تعلیم میں دیسی زبانوں کا درجہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور اُمید ہی کہ آیندہ ایسا زمانہ آئیگا کہ ہماری زبانیں یونیورسٹی کی تعلیم کا بھی ذریعہ قرار دی جائیں گی۔

لیکن کے ساتھ ہی کمیشن نے دیسی زبانوں کی ادبی تعلیم کو یونیورسٹی میں قدیم السنہ کے ساتھ ساتھ رکھا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی بڑی خوش قسمت ہی کہ اس نے بنگالی زبان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کر لیا ہے اور اس کے لئے ایک فاضل بنگالی ادیب کا بھی تقرر ہو چکا ہے۔ ہمیں اُمید ہی کہ اُردو زبان کو بھی وہی درجہ دیا جائے گا کیوں کہ بنگال میں مسلمانوں کی تعداد نصف سے زائد ہی اور وہ اُردو کو اپنی قومی اور تعلیمی زبان خیال کرتے ہیں۔ بعض دوسرے یونیورسٹیوں نے بھی دیسی زبانوں کو اپنے امتحانات میں شریک کیا ہی۔ لیکن ابتدا میں جو غلطی انگریزی تعلیم کے متعلق ہوئی تھی کہ زیادہ توجہ اعلیٰ اور ثانوی تعلیم کی طرف کی گئی اور ابتدائی تعلیم کو زیادہ قابل التفات خیال نہ کیا گیا وہی غلطی دیسی زبانوں کے متعلق کی گئی ہی یعنی بجائے نیچے سے شروع کرنے کے اوپر سے ابتدا کی گئی ہے۔ ایک زمانہ کے بعد اس غلطی

کی اصلاح بھی ہوگی۔ خصوصاً جب کہ ثانوی تعلیم میں ایک ذریعۂ تعلیم دیسی زبان بھی قرار دیا گیا ہے۔

ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں ہماری زبانوں کا ذکر صرف اس قدر آیا ہے اور اس میں بھی ہمارا حصّہ بہت کم ہے۔ اکثر و بیشتر بلکہ ہمیشہ تحریک دوسری طرف سے ہوئی ہے۔ ہم نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کے لئے سرکار میں بڑے بڑے پرزور میموریل بھیجے، بڑی بڑی فیاضیاں دکھائی ہیں، قربانیاں کی ہیں، لیکن کبھی اپنی زبان کی ترقی کے لئے کوئی باضابطہ اور متفقہ کوشش نہیں کی۔ اور جب کبھی کوئی ایسی کوشش ہوئی تو وہ بھی اکثر اجنبیوں کی طرف سے۔ البتہ ہم نے انگریزی کے شوق میں اس کی مخالفت ضرور کی ہے۔ اپنی زبان کی طرف سے یہ غفلت خودکشی تک پہنچ گئی ہے۔

اسی چند سال کے عرصہ میں یہ مسئلہ امپیریل لیجس لیٹو کونسل میں بھی پیش ہوا تھا۔ رعایا کے اکثر فاضل نمایندوں نے اس سے اختلاف کیا اور سب سے زیادہ مخالفت کی آواز بنگال سے بلند ہوئی۔ یہ ہیں ہمارے نمایندے جو شاہی مجلس وضع آئین و قوانین میں ہماری نیابت کرتے ہیں۔ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انگریزی کو ٹھیس لگ جائے۔ اللہ۔ اللہ! انگریزی اس قدر عزیز اور اپنی زبان اس قدر حقیر۔

نتیجہ اس کجروی اور بے پروائی کا یہ ہوا کہ ہمارے دل و دماغ، ہمارے خیالات، ہمارے کاروبار پر انگریزی کی حکومت ہوگئی۔ اندر باہر، گھروں میں اور مدرسوں میں، تحریروں اور تقریروں میں خط و کتابت میں اور ملاقاتوں میں یہاں تک کہ قومی مجلسوں اور انجمنوں میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ انگریزی بولنا اور لکھنا فخر سمجھا جاتا ہے۔ علم کے معنی انگریزی جاننے کے ہوگئے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہم خیال میں، عمل میں، تمدن میں، اخلاق میں مصنوعی آدمی ہو گئے ہیں اور ہمارا طرز عمل بالکل بہروپیے کا سا ہے۔ اور اس طرز عمل کا اثر یہ ہے کہ ہماری زبان جنگل کے ایک خودرو درخت کے مانند رہ گئی ہے جس کی پرورش قدرت کی عنایت پر ہے اور جس کا دیکھنے والا سوائے متلون مزاج فطرت کے اور کوئی نہیں۔

ایک مدت کے بعد اور وہ بھی دردناک مثالیں دیکھکر بعض ہمدردانِ ملک کو یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ جس تعلیم کو ہم سرمایۂ حیات خیال کئے ہوئے تھے وہ قاطع حیات نکلی۔ ہمارے طلبہ کی حالت، خواہ وہ فارغ التحصیل ہوں یا زیر تعلیم بہت قابلِ رحم ہے۔ اگر ان کا طبی معائنہ کرایا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے جسم روگ سے بھرے

ہوئے ہیں۔ اعضا میں توانائی نہیں، نشو و نما رُک ہی گئی ہے، آنکھوں میں نور نہیں، دل میں اُمنگ نہیں، رہا دماغ بیچارہ سو تھکا ماندہ، مستعدی، شوخی، بے چینی، اُمنگ، حوصلہ اور ہمّت جو اس سِن کا مقتضا ہی، سب مدّھم پڑگئے ہیں۔ اگر اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو معلوم ہوگا کہ بہت سے منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی رستہ میں تھک کر بیٹھ گئے۔ بہت سے منزل مقصود پر پہنچتے پہنچتے ایسے چُور ہوگئے کہ بیٹھے تو پھر نہ اُٹھے۔ اور جو سب مُصیبتیں جھیل کر نکل آئے اُن میں سے بھی بہت ایسے ملیں گے جو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ ضعف بصارت، ضعف معدہ، سِل، ضعف دماغ یہ امراض ہمارے طلبہ اور تعلیم یافتہ اصحاب کے ساتھ کچھ مخصوص سے ہوگئے ہیں۔ بعض صاحبوں نے حساب لگا کر دریافت کیا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ اصحاب کی اوسط عمر بہت کم ہوتی ہی اور ان میں سے اکثر عالم جوانی ہی میں رخصت ہوجاتے ہیں مستثنیٰ حالتوں کا ذکر نہیں لیکن ان میں سے کوئی کوئی جو بڑے قابل اور فاضل کہلاتے ہیں اگر وہ اپنے گریبانوں میں مُنہ ڈال کر دیکھیں تو خود معلوم ہوجائے گا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ ہمارے طالب علم فی الحقیقت تعلیم کے پیچھے مجنون ہوجاتے ہیں، سب کچھ نذر کر دیتے ہیں مگر لیلائے علم پھر بھی نہیں ملتی۔ اور ملتی بھی ہے تو ایسے وقت میں جب ہم کام کے نہیں رہتے۔

اس میں طریقۂ تعلیم کا بھی قصور ہے، لیکن اصل نقص اور تمام عیوب کی جڑ یہ ہے کہ ذریعۂ تعلیم ایک غیر اور بالکل اجنبی زبان قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بڑھکر کوئی ظلم تعلیم کے حق میں نہیں ہوسکتا۔ یہ دردناک منظر جو ہم اپنے طالب علموں کا دیکھتے ہیں اسی خرابی کا نتیجہ ہے۔ انگریزی کو ہماری زبان سے مطلق کوئی مناسبت نہیں، اوّل تو اس ٹیڑھی اور کٹھن زبان کا حاصل کرنا ہی ایک آفت ہے اس پر اسے تمام مضامین اور علوم کی تحصیل کا ذریعہ قرار دینا آفت پر آفت ہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ زبان ہی اچھّی طرح آتی ہے اور نہ علم۔ خیر اگر یہیں تک ہوتا تو کچھ بُرا نہ تھا۔ غضب یہ ہی کہ اس کے بجائے وہ تمام جسمانی اور دماغی خرابیاں ملتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے دماغ اور حافظہ پر بہت بیجا بار پڑتا ہے۔ طالب علم مجبور ہوکر الفاظ اور عبارت رٹنے لگتے ہیں اور مفہوم سے ناآشنا رہ جاتے ہیں۔ اور یہ پہلا زینہ ہے اُس ذہنی خودکشی کا جس کے مرتکب ہمارے طلبہ ہوتے ہیں یہیں سے الفاظ مفہوم عبارت و معانی میں بیگانگی شروع ہوجاتی ہی بے معنی تقلید اور دماغی غلامی کی بنیاد پڑجاتی ہے اور روز بروز قوت اجتہاد زائل ہونے لگتی ہی یعنی علاوہ جسمانی اضمحلال اور دماغی بار اور ضعف کے

بد اخلاقی بھی شریک حال ہو جاتی ہے۔

زبان صرف اظہارِ خیالات کا آلہ ہی نہیں بلکہ اس کا بہت بڑا تعلق فکر و عقل سے بھی ہے۔ جو زبان ہم بولتے ہیں جس میں ہم ابتدا سے پرورش پاتے ہیں وہ صرف بات چیت ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ وہ ہمارے روایات، تمدن معاشرت، اخلاق و مذہب اور قومیت و روحانیت کی بھی حامل ہے۔ اسے ترک کرنا یا اس کی طرف سے غفلت کرنا ان سب چیزوں کو جو مایۂ حیات بلکہ جان سے زیادہ عزیز ہیں، صدمہ پہنچانا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصہ سے اہل ملک اس طرف کسی قدر متوجہ ہوئے ہیں، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ دل سے اپنی زبان کی قدر کرتے ہیں بلکہ اس کی تہ میں سیاسی انقلاب ہے اس پر لاحب علی بل لبغض معاویہ کی مثل صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کوئی باقاعدہ کوشش اپنی زبان کی ترقی کے لئے نہیں کی گئی۔ جو لوگ سوراج حاصل کرنے پر آمادہ ہیں اور اس کے لئے جان و مال عزت آبرو سب کچھ تج دینے کے لئے تیار ہیں انھیں پہلے اپنی زبان کی خبر لینی چاہیئے۔ سوراج کی مقدم شرط "سولبھاکا" ہے۔ جن کی اپنی زبان نہیں وہ گونگے ہیں اور دربارِ اقوام میں گونگے بار نہیں پا سکتے اور نہ سوراج کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ سیاسی آزادی سے پہلے دماغی آزادی کی ضرورت ہے۔

اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں خلد اللہ ملکہ کی یہ اعلیٰ درجہ کی دور اندیشی ہے کہ انھوں نے سب سے اوّل اس مرض کو پہچانا اور اپنی ریاست میں ایک ایسی یونیورسٹی کی بُنیاد قایم کرائی جس میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اُردو زبان ہے اور بقول آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو وہ کارنامہ "جو ہندوستان کے اس دورِ جدید میں جو گوناگوں خیالات و توقعات سے گونج رہا ہے علمی نظر سے سب سے زیادہ انقلاب انگیز ہے عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام ہے جس کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ تمام علوم و فنون کی تعلیم اُردو زبان کے ذریعہ سے دی جائے گی۔ یہ یونیورسٹی مشرق و مغرب کا سنگم ہو گی، جہاں طالبانِ علم و تحقیق اپنی پیاس بجھائیں گے اور اپنی زبان و ملک کو بیش بہا معلومات اور جدید تحقیقات سے مالا مال کریں گے۔ یہ پہلا وقت ہے کہ ایک دیسی زبان کو یہ رُتبہ نصیب ہوا ہے۔ یہ پہلا وقت ہے کہ ہندوستان کے علمی کارخانے میں تقلید کے بندھن توڑے گئے ہیں۔ یہ پہلا وقت ہے کہ اس عہد میں فطری اور حقیقی اصول پر تعلیم کے اجرا کا موقع دیا گیا ہے، جو قومی تعلیم کی عمارت کا سنگِ بُنیاد ہے"[۵]

[۵] سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو، بابت ۱۹۱۷ء

عام طور پر تعلیم کے دو طریقے ہیں۔ ایک بذریعہ پیرا فریز (Para phrase) یعنی کتاب کے مطالب کو اُسی زبان میں ادا کرنا جس میں کتاب لکھی ہے۔ دوسرا بذریعہ ترجمہ۔

ہمارے مدارس اور کالجوں میں پہلا طریقہ رائج ہے۔ یعنی تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں اور انگریزی ہی میں اس کے مطالب و معانی بیان کئے جاتے ہیں۔ چوں کہ یہ طریقہ ابتدائے تعلیم سے رائج ہے لہٰذا اس کا نتیجہ دماغی، اخلاقی اور جسمانی ضعف ہوتا ہے جس کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ مادری زبان ذہنی تربیت کا بہت بڑا ذریعہ ہوتی ہے اور چوں کہ ہمارے مدارس اور کالجوں میں اس کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں لہٰذا عام ذہنی تربیت ناقص ہو جاتی ہے اور اس سے تمام تعلیم کو نقصان پہنچتا ہے اور طلبا میں فہم و شعور کی کافی ترقی نہیں ہوتی اور وہ کسی زبان میں بھی اپنے مافی الضمیر کے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔ بخلاف اس کے مادری زبان کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں اُن کی دماغی تربیت قدرتی طور سے ہوتی ہے ذہن میں روشنی اور رسائی پیدا ہوتی ہے۔ سمجھ تیز ہو جاتی ہے۔ توجہ کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ صحیح اور غیر صحیح بُرے اور بھلے میں امتیاز ہونے لگتا ہے۔ مفہوم پر قدرت ہوتی ہے۔ طالب علم رٹنے کی بیجا مشقت سے بچ جاتا ہے اور اُسے اپنے پر اعتماد پیدا ہو جاتا ہے جو اخلاق اور علم دونوں کے لئے ضروری ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مادری زبان کے ذریعہ سے تعلیم و تربیت تعلیم کی اصل بنیاد ہے علاوہ اس کے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ صحیح علم ہمیں ہمیشہ مقابلہ سے حاصل ہوتا ہے اور جب تک ہم انگریزی زبان کو بجائے اس زبان میں دُہرانے کے بذریعہ ترجمہ نہ پڑھیں گے ہم صحیح مفہوم کے حاصل کرنے سے قاصر رہیں گے یہ ممکن ہے کہ طالب علم انگریزی میں صفائی سے کسی لفظ یا اصطلاح کی تشریح و تصریح کرے لیکن جب تک اُسے یہ نہ معلوم ہوگا کہ خود اس کی زبان میں اُسے کیا کہتے ہیں اس کے دماغ میں کبھی اس کا صحیح مفہوم نہ آئیگا۔ اس میں ایک اور بات قابل غور یہ ہے کہ "پیرا فریز" کے ذریعہ سے پڑھانے میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کے خیالات اور اعلیٰ درجہ کی عبارت کو کمزور ناقص اور پھسپھسی زبان میں ادا کیا جاتا ہے اور اُن کی ادبی خوبیاں ذہن میں نہیں آتیں۔ اس طرح سے پڑھانا گویا اُن انمول موتیوں کو خاک میں ملانا اور اُن لطیف خیالات کا خون کرنا ہے۔ اگر تعلیم ترجمہ کے ذریعہ سے ہو تو خیالات کی خوبی اور نزاکت، ادبی نکات اور قوت بیان اور عبارت کی خوبیاں زیادہ اچھی طرح ذہن نشین ہو سکتی ہیں مادری زبان کی تعلیم سے جو غفلت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم کا ذریعہ

انگریزی رہا اور اس سے انگریزی کی تحصیل میں بھی زیادہ فائدہ نہوا۔ اور تجربہ سے یہ ثابت ہوگیا ہے اور ماہران تعلیم کی شہادت موجود ہے کہ جن طلبہ کی تعلیم مادری زبان سے ہوئی ہے وہ زیادہ سمجھدار اور مستعد ہوتے ہیں غیر زبان کو ضرورت سے زیادہ اور قبل از وقت ذریعۂ تعلیم بنا دینے سے دماغ پریشان اور کند ہو جاتا ہے اور اس کی تلافی حافظہ سے کی جاتی ہے اور آخر میں وہ بھی جواب دیدیتا ہے۔ اور سب سے بڑا غضب یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں خود ہمارے قدیم السنہ (عربی، سنسکرت، فارسی) اور دیسی زبانیں انگریزی کے ذریعہ سے پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ طریقہ کس قدر بے عقلی پر مبنی ہے اور اس سے بڑھ کر کیا بدنصیبی ہو سکتی ہے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ابتدا سے انگریزی پڑھانے اور انگریزی کے ذریعہ سے تمام مضامین پڑھانے میں انگریزی زبان کی تحصیل میں بہت بڑی سہولت متصور ہے۔ یہ خیال بھی غیر ممالک سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہ وہیں ممکن ہے جہاں اندر باہر اُسی زبان کا رواج ہو اور ہم جماعت، عزیز اقارب، دوست آشنا اُسی زبان کا استعمال کرتے ہوں۔ ہمارے مدارس میں صرف گھنٹہ دو گھنٹے تو انگریزی پڑھائی جاتی ہے باقی طالب علم جہاں جاتا ہے اُسے اپنی زبان بولنی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کچھ زیادہ قابل وقعت نہیں۔

دُنیا میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا بدنصیب مُلک ہے جہاں ذریعۂ تعلیم غیر زبان ہے اور یہی نہیں بلکہ اپنی زبان کی طرف سے نہایت بے پرواہی اور غفلت کی جاتی ہے اور اُسے حقیر خیال کیا جاتا ہے۔ کیا انگلستان، جرمنی یا فرانس میں کوئی نوجوان تعلیم یافتہ کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے جو اپنی زبان پر قدرت نہ رکھتا ہو یا اپنے ادب سے واقف نہ ہو اور اپنے خیالات و جذبات کو صحیح طور سے ادا نہ کر سکتا ہو؟ پھر کس اصول اور کس بنیاد پر ہمارے نوجوان جو کالجوں سے پڑھکر نکلتے ہیں، تعلیم یافتہ کہلا سکتے ہیں۔

ایک خیال یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے سے انگریزی کمزور ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہ رائے بغیر غور کئے قایم کی گئی ہے اور تجربہ پر مبنی نہیں ہے۔ اس سے انگریزی کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اس سے انگریزی کی تحصیل میں مدد ملتی ہے اور دیسی زبان اس کا تکملہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس طریقہ سے انگریزی روزمرہ اور محاورات ذرا دیر سے ذہن نشین ہوتے ہیں مگر جب ایک دفعہ ذہن نشین ہو گئے تو پھر عمر بھر نہیں نکل سکتے۔ علاوہ اس کے مادری زبان کی تعلیم سے جو دماغی تربیت ہوتی ہے اس سے انگریزی زبان کی تحصیل

میں بڑی مدد ملے گی۔

ہمارا مقصد انگریزی تعلیم کا گھٹانا یا اسے نقصان پہنچانا نہیں ہے بلکہ ہم انگریزی یا یورپی زبان کی تعلیم لازم و لابد خیال کرتے ہیں۔ کیوں اس زمانہ میں اس کے بغیر تعلیم کمل نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم صحیح طریقۂ تعلیم پر زور دینا چاہتے ہیں جو عقل و تجربہ پر مبنی ہے اور جو بغیر مادری زبان کے ہمیشہ ناقص اور نامکمل رہیگا۔ اور بغیر مادری زبان کی باقاعدہ اور اعلیٰ تعلیم کے انگریزی یا کسی دوسرے یورپی زبان کی تحصیل بھی مفید نہیں ہو سکتی۔

ہمارے ملک میں تعلیم کی بڑی غرض سرکاری ملازمت یا نوکری کا حاصل کرنا ہے۔ یہ اس تعلیم کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اس کی ابتدا بھی اسی نیت سے ہوئی اور غالباً انتہا بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو بڑی غایت تحصیلِ علم یا اشاعتِ ہے۔ علم اس طریقۂ تعلیم سے جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ جیسا کچھ آتا ہے ظاہر ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ صورت کچھ ایسی آپڑی ہے کہ اس کا منشا علم کی تحصیل رہا ہی نہیں۔ جب تک مدارس یا کالجوں میں ہیں، بڑا مقصد امتحان میں کامیاب ہونا ہے اور مدارس اور کالجوں سے نکل کر نوکری حاصل کرنا۔ اس تعلیم کی بنیاد کچھ ایسے وقت اور ایسی نیت سے پڑی تھی کہ علم کی برکت بالکل اُٹھ گئی ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ غیر زبان جو ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی ہے ہماری سنگ راہ ہے۔ دوسرے ہمارے نصاب تعلیم میں دیسی زبانوں کا کہیں پتہ نہیں۔ قدیم روایات، اپنے اخلاق و خصائل، اپنے ہاں کے ادبا و شعرا کے کلام کی خوبیوں سے بے بہرہ و بیگانہ رہنے کے علاوہ ذہنی تربیت بھی نہیں ہونے پاتی اور ہم مدارس میں مشین کی طرح ایک مدت معین تک گھاس کاٹتے رہتے ہیں اور اس کے بعد ایک کارخانہ سے دوسرے کارخانہ میں جا پہنچتے ہیں جہاں پھر وہی مشین کا سا کام کرنا پڑتا ہے۔ علم نہ اس تعلیم کا مقصد ہے اور نہ تعلیم پانے والے کا۔ اب اگر کوئی باوجود ان رکاوٹوں کے ایسا نکل آتا ہے جو کچھ جانتا اور سمجھتا ہے تو اس کا جاننا اور سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا گونگے کا گڑ کھانا کہ وہ دل ہی دل میں مزے لیتا ہے اور کچھ کہہ نہیں سکتا۔ انگریزی تعلیم خود مقصود بالذات نہیں ہے۔ بلکہ ذریعہ و آلہ ہے اس بات کا کہ اپنی مادری زبان میں علم کی اشاعت کریں اور جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اپنی زبان کے ذریعہ سے اپنے بھائیوں تک پہنچائیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی ملک اور قوم کی خدمت نہیں ہو سکتی۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ بہت دشوار ہے کیوں کہ ہم نے اپنی زبان اور ادب کا کبھی غور اور تحقیق سے مطالعہ نہیں کیا، کبھی اس کی تحصیل میں دل سے سعی نہیں کی۔ زبان پڑھی تو غیر اور

علوم پڑھے تو غیر زبان میں۔ اب اپنی زبان میں ادا کریں تو کیوں کر۔ اگر اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے جب ہندوستان میں جدید تعلیم کا آغاز ہوا تھا ہمیں تعلیم اپنی زبان میں دی جاتی اور اُن نامور ادیبا اور یکتائے روزگار شعرا کا کلام جو داخل نصاب ہی ہمیں اپنی زبان میں سمجھایا جاتا اور تمام علوم و فنون کی تحصیل ہماری زبان میں ہوتی تو آج ہماری زبان کہاں سے کہاں پہنچ جاتی اور کچھ نہیں تو کم سے کم اس ذلت و گمنامی کی حالت میں نہ رہتی۔ اُس وقت ہمارے تعلیم یافتہ کیسے کیسے کام کرتے اپنے علم سے قوم کی خدمت کرتے اور ملک میں روشنی پھیلاتے اور جو عام جہالت اور تاریکی اس وقت پائی جاتی ہے وہ کبھی نہ ہونے پاتی۔

ان حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں جامعۂ عثمانیہ کی قدر ہوتی ہے جس میں تمام علوم و فنون اُردو کے ذریعہ سے پڑھائے جاتے ہیں اور انگریزی زبان و ادب کی تعلیم لازم قرار دی گئی ہے۔ تاکہ ایک طرف ہم انگریزی سے استفادہ کر سکیں اور دوسری طرف ہر قسم کے علوم و مضامین کو اپنی زبان میں ادا کر سکیں۔ جو لوگ اس یونیورسٹی سے تعلیم پا کر نکلیں گے اُن سے بجا طور پر یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ علم کی نشر و اشاعت سے اپنے ملک کی خدمت کریں گے جو کچھ انھوں نے خود حاصل کیا ہے اُسے اپنے بھائیوں تک پہنچائیں گے اور علم کی منزل کو جو اس وقت غیر زبان کے حائل ہونے سے سخت دشوار گزار ہے، آسان کریں گے۔

اُنیسویں صدی کے آغاز یعنی ۱۸۰۰ء میں مارکوئیس آف ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد ڈالی اور اس میں ہمارے قدیم و جدید زبانوں اور ہندو مسلمانوں کے قوانین وغیرہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اگرچہ اس کالج میں بعض اور زبانیں بھی پڑھائی جاتی تھیں لیکن سب سے زیادہ اہمیت اور وقعت اُردو زبان کی تعلیم کو دی جاتی تھی کیوں کہ وہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان خیال کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس کالج میں جس قدر کام اُردو زبان کے متعلق ہوا اور جس قدر اُردو میں کتابیں لکھی گئی ہیں اور عام طور سے جو وقعت اسے حاصل تھی وہ کسی دوسری زبان کو نہ تھی۔ بلکہ دوسری زبانوں کا انتظام بھی کافی طور پر نہ تھا۔ یہ کالج اُن نوجوان انگریزوں کے لئے جو نئے نئے انگلستان سے آتے تھے نیز یہاں کے ملازم انگریزوں کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ تاکہ وہ یہاں کی زبان، رسم و رواج اور قانون وغیرہ سے واقفیت حاصل کریں۔ کمپنی کے ڈائرکٹر ابتدا سے اس کالج کے مخالف تھے اور آخر وہ تین چار سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۳۲ء میں فارسی سرکاری دفاتر سے خارج کی گئی اور اُردو اس کی قائم مقام ہوئی یعنی اُردو کو علاوہ

ملک کی عام زبان ہونے کے سرکاری رسوخ اور درباری ہونے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔ اگر ہماری تعلیم ابتدا سے
غلط اصول پر قایم نہ ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ آج اُردو کا ستارہ اوج پر ہوتا۔ یہی ایک زبان تھی جس پر نظرِ
انتخاب پڑتی اور جو ملک میں عام طور پر رائج تھی اور ملک کے بیشتر حصّے کے لیے یہی ذریعۂ تعلیم قرار دی جاتی لیکن
بدنصیبی سے انگلستان کے طریقۂ تعلیم کی تقلید میں وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اب سوا سو برس کے بعد دکن میں جہاں
اُردو نے سب سے پہلے ادبی صورت اختیار کی تھی، اس افسوسناک فروگزاشت کی تلافی ہوئی ہے۔ ہندوستان جیسے
وسیع اور عظیم الشّان ملک میں جہاں "بھانت بھانت" کی بولیاں بولی جاتی ہیں یہی ایک زبان اس عزت کی
مستحق ہوسکتی ہی۔ جو اکثر جگہ بولی اور ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ جو ہندو مسلمانوں کے اتحاد اور میل جول کی مُبارک
یادگار ہی۔ اتحاد جس کے خمیر اور سرشت میں ہے اور یقین ہے کہ وہ آیندہ بھی اس مقدس فرض کو انجام دیگی
اور ہندوستان کی مختلف اقوام میں رابطۂ اتحاد و اتفاق کو قایم اور مستحکم رکھے گی۔ خاص کر ریاست حیدرآباد
دکن میں جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اس سے زیادہ کسی کو ذریعۂ تعلیم ہونے کا حق نہیں۔ یہ ریاست میں
ہر جگہ بلاتکلف سمجھی اور بولی جاتی ہے سرکاری اور درباری زبان ہی۔ ہندو مسلمان دونوں اسے شوق سے پڑھتے
اور استعمال کرتے ہیں اور عدالتوں، دفتروں، مجلسوں اور انجمنوں میں یہی ذریعۂ اظہار خیالات ہی۔ اور اس لیے سب سے
پہلے اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ اسے قرار دینا ہر طرح قرینِ مصلحت تھا۔ قطع نظر اس کے یہ پہلا اور نیا تجربہ ہی اور اس کی
کامیابی پر دوسری زبانوں کی ترقی کا بہت کچھ دار و مدار ہے اور اس تجربہ سے دوسری زبانوں کو بہت سے نئے
اور عجیب سبق ملیں گے۔

اس کے متعلق ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اُردو زبان میں اتنی سکت کہاں ہی جو اعلیٰ تعلیم کی متحمل ہو۔ یہی
عذر ۱۸۳۵ء میں کیا گیا تھا اور یہی اعتراض ۱۸۵۴ء کے ڈسپیچ میں وارد ہوا تھا اور آج سوا سو برس بعد پھر یہی
اعتراض کیا جاتا ہی۔ اور آیندہ جب کبھی اس کا موقع آئیگا تو یہی اعتراض کیا جائے گا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اُردو
یا ہندوستان کی کوئی زبان بھی کبھی اس قابل نہیں ہوسکتی کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار پاسکے۔ اگر ہمارا نظام تعلیم
یہی رہیگا جو اس وقت ہی، اگر ہماری غفلت اپنی زبانوں کی طرف سے یہی رہے گی جو اب ہی تو شاید کبھی ایسا زمانہ
نہ آئیگا کہ ہم اپنی کسی زبان کو علمی دُنیا میں سُرخرو دیکھیں۔ اگر ہم ابتدا سے اس کا خیال رکھتے یا ہماری تعلیم صحیح

اُصول پر ہوتی تو آج ہماری زبان ادبی اور علمی لحاظ سے مالا مال ہوتی۔ جب تعلیم غیر زبان اور غیر زبانوں کے ذریعہ سے ہوتی ہو تو زبان میں قوت کہاں سے پیدا ہوتی۔ جب مانگ ہی نہ تھی تو کتابیں کہاں سے آتیں۔ اب ضرورت ہوئی ہے تو اس کا سامان بھی ساتھ ساتھ مہیا ہو جائے گا۔

کیا اب اس وقت تک انتظار کرنا مناسب ہوگا کہ یہ اس قابل ہو جائے؟ اور اس انتظار کی کوئی حد کوئی وقت؟ محض انتظار کوئی چیز نہیں۔ اور نہ وہ کسی شے میں صلاحیت یا قابلیت پیدا کر سکتا ہو۔ ہر زبان کی ابتدا میں یہی حالت ہوتی ہو۔ زبانیں بنانے سے بنتی اور محنت سے ترقی کرتی ہیں۔ پچاس برس قبل جاپانی زبان اُردو سے زیادہ وسیع نہ تھی۔ خود انگریزی زبان چند صدی پہلے کیا تھی۔ اس کے نامور مورخ اور فلسفی لاطینی اور فرانسیسی میں لکھنا زیادہ باعث فخر سمجھتے تھے۔ اردو اگر کم مایہ ہو تو ہماری سعی سے صاحب سرمایہ ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کمزور ہے تو ہماری محنت سے قوی بن سکتی ہو۔ اور یہ عین مصلحت پر مبنی تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی قایم کرنے سے قبل تالیف و ترجمہ کا ایک سررشتہ قایم کر دیا گیا جو بقول سکرٹری انجمن ترقی اُردو "اس یونیورسٹی کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہو"۔ چنانچہ اس سررشتہ نے نصاب تعلیم کی کتابیں ترجمہ اور تالیف کیں اور اس وقت تک برابر اس کام میں مصروف ہو۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ محض ترجمہ کافی نہیں۔ یہ بھی سچ ہو۔ لیکن موجودہ حالت میں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں خصوصاً جب کہ ملک میں ایسے قابل مصنف نہیں جو ہر فن میں ایسی کتابیں تصنیف کر سکیں جو یونیورسٹی میں پڑھانے کے لایق ہوں۔ ہم مولوی عبدالحق (ناظم سررشتہ تالیف و ترجمہ) کے اس خیال سے بالکل متفق ہیں جو انھوں نے مطبوعات یونیورسٹی کے مقدمہ میں ظاہر کیا ہو۔

"دُنیا میں ہر قوم کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جب کہ اُس کے قوائے ذہنی میں انحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، ایجاد و اختراع اور غور و فکر کا مادّہ تقریباً مفقود ہو جاتا ہے۔ تخیّل کی پرواز اور نظر کی جولانی تنگ اور محدود ہو جاتی ہے، علم کا دار و مدار چند رسمی باتوں اور تقلید پر رہ جاتا ہو۔ اُس وقت قوم یا تو بیکار اور مُردہ ہو جاتی ہو یا سنبھلنے کے لئے یہ لازم ہوتا ہو کہ وہ دوسری ترقی یافتہ اقوام کا اثر قبول کرے۔ تاریخ عالم کے ہر دَور میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ خود ہمارے دیکھتے دیکھتے جاپان پر یہی گزری اور یہی حالت اب ہندوستان کی ہے۔

جس طرح کوئی شخص دوسرے بنی نوع انسان سے قطع تعلق کرکے تنہا و الگ تھلگ نہیں رہ سکتا اور اگر رہے تو پنپ نہیں سکتا، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی قوم دیگر اقوام عالم سے بے نیاز ہو کر پھولے پھلے اور ترقی پائے جس طرح ہوا کے جھونکوں اور ادنیٰ پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کے اثر سے وہ مقامات تک ہرے بھرے رہتے ہیں جہاں انسان کی دسترس نہیں اسی طرح انسانوں اور قوموں کے اثر بھی ایک دوسرے تک اُڑ کر پہنچتے ہیں جس طرح یونان کا اثر روما اور دیگر اقوام یورپ پر پڑا جس طرح عرب نے عجم کو اور عجم نے عرب کو اپنا فیض پہنچایا جس طرح اسلام نے یورپ میں تاریکی اور جہالت کو مٹا کر علم کی روشنی پہنچائی، اسی طرح آج ہم بھی بہت سی باتوں میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ قانونِ عالم ہے جو یوں ہی جاری رہا اور جاری رہیگا ع

دیئے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے

جب کسی قوم کی نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب قوم میں جدت اور اپج نہیں رہتی تو ظاہر ہے کہ اس کی تصانیف معمولی، ادھوری، کم مایہ اور ادنیٰ ہوں گی۔ اس وقت کی بڑی خدمت یہی ہے کہ ترجمہ کے ذریعہ سے دنیا کی اعلیٰ درجہ کی تصانیف اپنی زبان میں لائی جائیں۔ یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور معلومات میں اضافہ کریں گے، جمود کو توڑیں گے اور قوم میں ایک نئی حرکت پیدا کریں گے اور پھر آخر یہی ترجمے تصنیف و تالیف کے جدید اسلوب اور ڈھنگ سجھائیں گے۔ ایسے وقت میں ترجمہ تصنیف سے زیادہ قابل قدر، زیادہ مفید اور فیض رساں ہوتا ہے۔

اس ضمن میں انجمن ترقی اردو سر رشتہ تالیف و ترجمہ کی مدد سے ایک بہت بڑا کام انجام دے رہی ہے وہ کام اصطلاحات علمیہ کا وضع کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام کس قدر اہم اور کس قدر ضروری ہے۔ ہر شخص جسے علمی کتاب کے ترجمے یا تالیف کا تجربہ ہے اس امر کی شہادت دیگا کہ اصطلاحات کی لغت نہ ہونے سے کیسی کیسی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ بعض قابل قابل لوگ جنھیں اپنے فن میں اچھی دستگاہ ہے اور قلم کے ذریعہ سے ملک کی خدمت کا بھی ارادہ رکھتے ہیں، انھوں نے بڑے شوق سے کام شروع کیا مگر قدم قدم پر اصطلاحات اُن کی سنگ راہ ہوئیں اور آخر مایوس ہو کر ارادہ ترک کرنا پڑا۔ یا اگر ہمت کرکے انجام کو پہنچا بھی دیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ جو اصطلاحات انھوں نے وضع کی ہیں ان میں سے یا تو اکثر اصول و قواعد زبان کے لحاظ سے غلط ہیں یا ایسی غیر مانوس ہیں کہ ان کا استعمال

گراں گزرتا ہے۔ یا وہ مجوزہ لفظ اس قسم کا ہے کہ اُس موقع پر تو کام دیتا ہے لیکن جب اس اصطلاح کے اشتقاق وترکیب کا سلسلہ آگے چلتا ہے تو رہ جاتا ہے اور اس میں توسیع کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ اس لغت کے تیار ہونے سے یہ مشکلات خود بخود رفع ہو جائیں گی اور اس سے ملک کو جو فوائد پہنچیں گے اور علوم کے نشر و اشاعت میں جو بیش بہا مدد ملے گی وہ محتاج بیان نہیں[1]۔"

اصطلاحات کے وضع کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اُس کی کیفیت ہم مطبوعات یونیورسٹی کے مقدمہ سے یہاں نقل کرتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

"اُس میں سب سے کٹھن اور سنگلاخ مرحلہ وضع اصطلاحات کا تھا۔ اس میں بہت کچھ اختلاف اور بحث کی گنجایش ہے۔ اس بارے میں ایک مدت کے تجربہ اور کامل غور و فکر اور مشورہ کے بعد میری یہ رائے قرار پائی ہے کہ تنہا نہ تو ماہر علم صحیح طور سے اصطلاح وضع کر سکتا ہے اور نہ ماہر لسان۔ ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے۔ اور ایک کی کمی دوسرا پورا کرتا ہے۔ اس لئے اس اہم کام کو صحیح طور سے انجام دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دونوں یک جا جمع کئے جائیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے مشورہ اور مدد سے ایسی اصطلاحیں بنائیں جو نہ اہل علم کو ناگوار ہوں نہ اہل زبان کو۔ چنانچہ اس اصول پر ہم نے وضع اصطلاحات کے لئے ایک ایسی مجلس بنائی ہے جس میں دونوں جماعتوں کے اصحاب شریک ہیں۔ علاوہ ان کے ہم نے اُن اہل علم سے بھی مشورہ کیا جو اس کی خاص اہلیت رکھتے ہیں اور بُعد مسافت کی وجہ سے ہماری مجلس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض الفاظ غیر مانوس معلوم ہوں گے اور اہل زبان انھیں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ لیکن اس سے گزیر نہیں۔ ہمیں بعض ایسے علوم سے واسطہ ہے جن کی ہوا تک ہماری زبان کو نہیں لگی۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے چارہ نہیں کہ جب ہماری زبان کے موجودہ الفاظ خاص خاص مفہوم کے ادا کرنے سے قاصر ہوں تو جدید الفاظ وضع کریں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم نے محض ٹالنے کے لئے زبردستی الفاظ گھڑ کر رکھ دیئے ہیں، بلکہ جس نہج پر اب تک الفاظ بنتے چلے آئے ہیں اور جن اصول ترکیب و اشتقاق پر اب تک ہماری زبان کاربند رہی ہے، اس کی پوری پابندی ہم نے کی ہے۔ ہم نے اُس وقت تک کسی لفظ کے بنانے کی جرأت نہیں کی جب تک اُس قسم کی متعدد مثالیں ہمارے

---

[1] سالانہ رپورٹ انجمن ترقی اُردو بابت ۱۹۱۷ء

پیش نظر نہ رہی ہوں۔ ہماری رائے میں جدید الفاظ کے وضع کرنے کی اس سے بہتر اور صحیح صورت کوئی نہیں۔ اب اگر کوئی لفظ غیر مانوس یا اجنبی معلوم ہو تو اس میں ہمارا قصور نہیں۔ جو زبان زیادہ تر شعر و شاعری اور قصص تک محدود ہو، وہاں ایسا ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں جس ملک سے ایجاد و اختراع کا مادّہ سلب ہو گیا ہو، جہاں لوگ نئی چیزوں کے بنانے اور دیکھنے کے عادی نہ ہوں۔ وہاں جدید الفاظ کا غیر مانوس اور اجنبی معلوم ہونا موجب حیرت نہیں۔ الفاظ کی حالت بھی انسانوں کی سی ہے۔ اجنبی شخص بھی رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اوّل اوّل الفاظ کا بھی یہی حال ہے۔ استعمال آہستہ آہستہ غیر مانوس کو مانوس کر دیتا ہے اور صحت و غیر صحت کا فیصلہ زمانہ کے ہاتھ ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ لفظ تجویز کرتے وقت ہر پہلو پر کامل غور کر لیں۔ آیندہ چل کر اگر وہ استعمال اور زمانہ کی کسوٹی پر پورا اُترا تو خود ٹکسالی ہو جائیگا اور اپنی جگہ آپ پیدا کر لے گا۔ علاوہ اس کے جو الفاظ پیش کئے گئے ہیں وہ الہامی نہیں کہ جن میں ردّ و بدل نہ ہو سکے، بلکہ **فرہنگِ اصطلاحاتِ عثمانیہ** جو زیر ترتیب ہے پہلے اس کا مسودہ اہلِ علم کی خدمت میں پیش کیا جائیگا اور جہاں تک ممکن ہوگا اس کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائیگا۔"

غرض ہمارے ملک کے نظام تعلیم میں ایک نئے اور مبارک دَور کا آغاز ہوا ہے۔ اور ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ ریاست حیدر آباد دکن ہی تک محدود نہ رہیگا بلکہ اس کی تقلید ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی کی جائیگی۔ اس اصول کو تسلیم سب کرتے ہیں، لیکن اسے عمل میں لانے کی ہمّت اب تک کسی کو نہ ہوئی تھی۔ اس کا سہرا حیدر آباد ہی کے سر رہا۔ اور اس پر اُسے جس قدر فخر ہو بجا ہے۔ کوئی تجویز ابتدا میں کامل نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ نظام تعلیم بھی نقص سے خالی نہیں۔ عمل اور تجربہ سے چھپے ہوئے نقص ظاہر ہوں گے اور ذمہ دار جماعتوں کا فرض ہوگا کہ اُن کی اصلاح کریں۔ سر دست اس بات کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ سر رشتۂ تالیف و ترجمہ کو زیادہ قوی اور وسیع کیا جائے تاکہ اس کا کام محض کتب نصاب ہی کے ترجمہ و تالیف تک محدود نہ رہے بلکہ وہ ہر فن اور علم پر متعدد اعلیٰ درجہ کی کتابیں ترجمہ اور تالیف کر سکے۔ تاکہ طلبا اور دوسرے اہلِ ملک کو اپنے معلومات کے وسیع کرنے کا موقع ملے۔ اور جب تک یہ نہ ہوگا کوئی معتدبہ فائدہ نہیں ہو سکتا اور نہ زبان کی ترقی میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

دوسری چیز جو نصاب تعلیم کے مرتب کرتے وقت نظرانداز کردی گئی ہے کہ مدارس فوقانیہ (عثمانیہ ہائی اسکولوں) میں اُردو زبان کی تعلیم مطلق نہیں رکھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو طالب علم فوقانیہ مدارس سے کامیاب ہوکر کالج میں داخل ہوں گے انھیں کتب نصاب کے سمجھنے میں دشواری ہوگی۔ یہ کہنا کہ چوں کہ ان مدارس میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے اور تمام مضامین کی کتابیں اُردو ہی میں پڑھائی جاتی ہیں لہذا اُردو زبان کی تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ معلومات کی کتابیں پڑھنے سے صحیح ذوق ادب کا نہیں پیدا ہوتا جب تک زبان کی تعلیم نہ ہو۔ اور جب تک ادبی ذوق طلبہ میں پیدا نہ ہو تو نہ تو وہ کتب معلومات کا لطف حاصل کرسکتے ہیں اور نہ اُن کے دل و دماغ میں وہ شایستگی اور لطافت پیدا ہوسکتی ہے جو تعلیم کا بہت بڑا مقصد ہے اور اگر اُردو تعلیم صرف مدارس وسطانیہ (مڈل) ہی تک محدود رہے تو اُن میں کافی قابلیت پیدا نہ ہوگی۔ لہذا اس کی شدید ضرورت ہے کہ کم سے کم مدارس فوقانیہ میں ہر طالب علم کے لئے اُردو زبان کی تعلیم لازم کی جائے یا اگر فی الحال یہ ممکن نہ ہو تو کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ یہ خامی رفع ہو جائے اُسے کم سے کم وہ رتبہ تو دیا جائے جو مدارس ثانویہ میں دوسری دیسی زبان کو حاصل ہے۔ اُردو زبان کے سوا باقی دوسرے تمام دیسی زبانوں میں سے طالب علم کوئی ایک زبان لے سکتا ہے ورنہ آگے چل کر یہ بڑا نقص رہ جائے گا۔

تیسرے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ اور تجربہ خانہ (لیبوریٹری) تیار کیا جائے تاکہ پروفیسروں اور طلبہ کے لئے مطالعہ اور تحقیق کا دروازہ کھُل جائے۔ محض چند کتابوں کا پڑھ لینا کافی نہیں جب تک طالب علموں میں مطالعہ اور تحقیق کا ذوق پیدا نہ ہو۔ محقق کالجوں میں نہیں بنتے بلکہ کتب خانوں اور تجربہ خانوں میں بنتے ہیں۔

لیکن ان سب سے بڑھ کر اس بات کی ضرورت ہے کہ یونیورسٹی کے لئے اعلیٰ درجہ کے پروفیسر مہیّا کئے جائیں در اصل یونیورسٹی عبارت ہی فاضل اور محقق پروفیسروں سے ایسے پروفیسر جن کی آواز صرف یونیورسٹی کے کمروں تک محدود نہ رہے بلکہ اس کی گونج ہندوستان کے ہر کونے میں بلکہ اس کے باہر بھی پہنچے۔ تاکہ طلبہ اُن کی شہرت سُن کر دُور دُور سے جوق جوق یونیورسٹی میں داخل ہوں اور اُن کے علم و فضل اور تحقیق سے استفادہ

کریں، غور و فکر کی عادت پڑے، تحقیق کی نئی راہیں نکالیں اور آیندہ زندگی کے لئے تیار رہوں۔

علاوہ اس کے یہ انتظام بھی کیا جائے کہ ہندوستان اور غیر ممالک کے باکمال علما اور اساتذہ کو معقول معاوضہ دے کر طلب کیا جائے تاکہ وہ کچھ دنوں رہ کر اپنے اپنے فن پر لکچر دیں اور اپنی تحقیقات پیش کریں اس سے طلبہ اور پروفیسروں پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ دوسرے کی تحقیقات پر غور کرنے کا موقع ملے گا معلومات میں اضافہ ہوگا، دماغ میں ایک نئی روشنی پہنچے گی۔ ذہن اور تخیل کو پر لگ جائیں گے اور جدت طرازی کے لئے ایک میدان کھل جائے گا۔ ان کاموں کے لئے اہل کمال کی صحبت کیمیا کا اثر رکھتی ہے سالہا سال کی محنت اور مطالعہ سے وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو ایک باکمال کی چند روزہ صحبت سے حاصل ہو جاتی ہے۔ حصول کمال کے لئے اہل کمال کی صحبت نہایت ضروری ہے۔ طلبہ پر ان کی عادت و خصائل، ان کی محنت ایثار، شوق، تحقیق و جستجو اور محویت کا نہایت عمدہ اثر ہوگا۔

چوں کہ اس یونیورسٹی میں تمام مروجہ دیسی زبانوں کی تعلیم کا ابتدا سے انتہا تک انتظام کیا گیا ہے لہذا ہماری درخواست ہے کہ اُن کی تعلیم برائے نام یا ادھوری نہ ہو۔ ان کی تعلیم میں خاص طور پر بڑی احتیاط کی جائے اور یہ تعلیم لسانی، ادبی، تنقیدی، تاریخی اور محققانہ ہونی چاہیئے تاکہ وہ چیز جو طلبہ کو دوسری یونیورسٹی میں نصیب نہیں یہاں حاصل ہو سکے اور حقیقی طور پر وہ ملک و قوم کی خدمت ادا کر سکیں اور ملک میں تہذیب ذوق اور علم و تحقیق کی روشنی پھیلا سکیں۔

اس یونیورسٹی کو حقیقی طور پر یونیورسٹی بنانے کے لئے ان انتظامات کا عمل میں لانا لازم ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ ایک معمولی تعلیم گاہ یا مدرسہ بن کر نہ رہ جائے۔ اس کام میں روپیہ کا مُنہ کرنا یا محنت سے جی چُرانا سخت ظلم ہوگا۔ ہر قسم کی ترقی جو ہو سکتی ہے کی جائے اور ہر اصلاح جو ممکن ہو عمل میں لائی جائے۔ اور اسے مکمل کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جائے۔

یہ یونیورسٹی مغرب و مشرق کا سنگم ہے۔ اس میں قدیم و جدید کو سمویا گیا ہے۔ دونوں طریقوں کی خوبیاں اس میں یکجا جمع کی جائیں گی اور ان کے عیوب سے بچنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ تہذیب ذوق اور حصولِ کمال کا مرکز ہوگی۔ اشاعتِ علم اور استیصالِ جہالت کرے گی۔ گذشتہ تجربے اور غلطیاں ہماری

رہنمائی کریں گی اور آیندہ کی اُمیدیں اور اُمنگیں ہمیں اصلاح و ترقی پر آمادہ کریں گی۔ اس مقدس فرض کی تکمیل میں بانیان و منتظمین یونیورسٹی کو کوئی چیز عزیز نہیں رکھنی چاہیئے۔ نہ کسی کی رائے اور تنقید سے ڈرنا چاہیئے اور نہ جدید اصلاحات کے رواج دینے میں پس و پیش ہونا چاہیئے۔ اسے کامیاب بنانا اُن کا سب سے بڑا نصب العین ہونا چاہیئے اس میں جس قدر خرچ ہو جائز ہے اور جس قدر محنت و مشقت برداشت کی جائے کم ہے۔

تمام اہلِ ہند اور بہی خواہانِ ملک کو خوش ہونا اور فخر کرنا چاہیئے کہ ایک مدت کے بھٹکے ہوئے صحیح رستہ پر آئے ہیں اور اس طریقۂ تعلیم کو رائج کرنا چاہتے ہیں جو فطرت کے مطابق حالات کے مناسب، کمال کا ذریعہ اور ملکی بہبودی کا وسیلہ ہے۔ فقط

معلّم

مختصر رُوداد

گزشتہ سالوں میں انجمن کا دستور تھا کہ اپنی کارگزاریوں کی مختصر رپورٹ ماہ دو ماہ کے فصل سے شائع کیا کرتی تھی لیکن کچھ عرصہ سے بعض موانع کی بنا پر یہ سلسلہ جاتا رہا تھا، اس رسالہ کے اجراء سے اشاعت مختصر رپورٹ کی بہت بڑی سہولت نکل آئی ہے، اس لئے ذیل میں پچھلے چھ ماہ یعنی جنوری سے جون تک کی مختصر رپورٹ حوالہ قلم کی جاتی ہے۔

۱ - ادبیات ایران - اس سال طبع کے لئے ضرور بھیجدی جائے گی۔

۲ - مصطلحات اہل حرفہ - آیندہ سال طبع ہو گی۔

۳ - اصول وضع اصطلاحات علمیہ (از مولوی وحید الدین صاحب سلیم) صاف ہونے کے بعد مطبع کو بھیجدی گئی، یقین ہے کہ بہت جلد شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

۴ - تاریخ ملل قدیم - زیر طبع ہے مگر تصاویر کی مشکلات کے باعث خلاف توقع تاخیر پیدا ہو گئی ہے۔

۵ - بجلی کے کرشمے - نظر ثانی ہو چکی ہے، عنقریب مطبع کے حوالہ کردی جائے گی۔

۶ - ادبیات عرب (مترجمہ خواجہ عبدالواحد صاحب) کی نظر ثانی ہو رہی ہے۔

۷ - انٹلکچوال ڈیولپمینٹ (مترجمہ مولوی اشرف علی صاحب بی اے) دو باب ترجمہ ہو چکے ہیں۔

۸ - تاریخ ایران - (مترجمہ سید سجاد) کی پہلی جلد کا ترجمہ ختم ہو چکا ہے دوسری جلد بھی ختم پر آگئی ہے۔

۹ - نفح الطیب - مطبع میں بھیجدی گئی۔

۱۰ - علم حشرات الارض - زیر تالیف ہے۔

۱۱ - نفسیات - زیر تالیف ہے۔

۱۲ - تاج خسروی - زیر تالیف ہے۔

۱۳ - تاریخ اُردو - زیر تالیف ہے۔

۱۴- فلسفۂ تعلیم- دوبارہ چھپ رہی ہے۔

۱۵- علم المعیشت - دوبارہ چھپ رہی ہے۔

۱۶- انتخاب کلام میر- دوبارہ چھپ رہا ہے۔

۱۷- مسٹر سید راس مسعود ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن اُردو کے مشہور پروفیسر گارسن دتاسی کے لکچروں کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے انجمن کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ لکچر اُردو زبان و ادب کے متعلق ہیں۔

شعبہ اصلاح زبان کے قیام و مفہوم کا حال گزشتہ سالانہ رپورٹ میں عرض کیا جا چکا ہے افسوس ہے کہ اس کے مزید جلسہ کا موقع پیدا نہ ہو سکا لیکن یہ رسالہ اس تجویز کو عمل میں لانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگا، نامانوس غلط اور متروک الفاظ کی فہرست موصول ہونے پر رسالہ میں پیش کی جائے گی تاکہ اُس پر غور و تنقید ہو سکے۔
گزشتہ سال کی تجویزوں میں ایک تجویز محبان اُردو کی تھی، اگرچہ اس کی تکمیل میں نہ خاص ایثار مطلوب تھا اور نہ مال و زر، صرف معمولی توجہ کے ذریعہ سے پانچ سال کے عرصہ میں ایک ناخواندہ شخص کو اُردو کی معمولی تعلیم دینے کا فرض ادا کرنا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ مدعیان اُردو نے اس تجویز پر التفات نہ فرمایا، اقرارنامے چھپے ہوئے تیار ہیں، جو صاحب اُردو زبان سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اپنے عزیز وقت کا کچھ حصہ اس کام میں صرف کر سکتے ہیں وہ اقرارنامہ صدر دفتر سے طلب فرمائیں۔

تدوین لغت کے لئے روپیہ فنڈ کا کام جاری ہے۔ بعض بہی خواہ خاص توجہ اور سرگرمی سے اعانت کر رہے ہیں، ان کی مساعی تحسین اور شکریہ کے لائق ہیں، تاہم کام کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ رپورٹ میں اس موضوع کی تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ کام کس قدر کثیر سرمایہ چاہتا ہے۔ اس لئے اگر انگریزی کی لغت ویبسٹر کے ارکان کی طرح اس کے معاونین کی تعداد ایک لشکر جرار کے برابر نہ ہو تو کم از کم ایک معقول جماعت ضرور ہونی چاہیئے جو استقلال و ہمت کے ساتھ سرمایہ کی فراہمی میں مصروف رہے، کام کرنے والے حضرات کے اسماء گرامی شکریہ کے ساتھ انجمن کی سالانہ رپورٹ میں شائع جائیں گے۔

انجمن کی آمد و خرچ، اراکین اور شاخوں کی تعداد اور دیگر ابواب و حالات منسلکہ گوشوارہ میں درج کئے جاتے ہیں۔

اصحاب ذیل کی توجہات شکریہ کے لایق ہیں :-
جناب مولوی سید محمد مہدی صاحب، مددگار رجسٹرار انجمن ہائے اتحادی حیدرآباد دکن ۔
جناب مولوی وحیدالدین صاحب تعلقہ دار بیڑ۔

گوشوارہ جمع خرچ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن — من ابتدائے یکم جنوری لغایتہ ۳۰ جون سنہ ۱۹۲۰ء

جمع				خرچ				کیفیت
نمبر	ابواب	سکہ کلدار	سکہ عثمانیہ	نمبر	ابواب	سکہ کلدار	سکہ عثمانیہ	
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
۔	سلک بابتہ سنہ ۱۹۱۹ء	سالعہ ۲/۲	صماسے ۵/۸	۱	صلہ مصنفین و مؤلفین	ماعہ		
۱	چندہ اراکین	مالعہ ۹/	لوعہ	۲	صلہ مترجمین	لالعہ ۶/۸		
۲	چندہ اراکین دوامی	للعاعہ	معاعہ	۳	طباعت	الـعہ ۳/		
۳	فروخت کتب ذریعہ صدر دفتر	صماعہ ۴/	مااللعہ ۸/۱	۴	جلدبندی	الـ ؍		
۴	فروخت کتب ذریعہ ایجنسی	لعماعہ ۱۲/	۔	۵	کرایہ ریل	۔	مااللعہ ۵/۱۰	
۵	کتب خانہ	معاماللعہ	۔	۶	تنخواہ عملہ	سمالعہ ۱۰/۹	لعہ ۸/۳	
۶	عطیہ دولت آصفیہ	اعلاعہ	۔	۷	اخراجات دفتر (فرنیچر و کرایہ مکان دفتر)	مالعہ ۱۱/	سماعہ ۹/۴	
۷	عطیہ دربار بھوپال	سار	۔	۸	خرچ ٹکٹ	ماعہ	عللعہ	
۸	لغت فنڈ	ماللعہ	سماعہ	۹	سفیر انجمن	الماعہ ۵/	۔	
				۱۰	خرید کتب	مالعہ ۶/	عہ	
				۱۱	متفرق	موعہ	۔	
				۱۲	ایجنٹوں کو کمیشن	ماعہ ۵/۱		
				۱۳	ادائے قرض	الـعہ ؍		
				۱۴	کاغذ برائے رسالہ	الـ ؍		
						معماللعہ ۹/۱۰/۱	سماعہ ۷/۵/۱	
	آمدنی	سماعہ ۳/۸/۱	مالعہ ۶/۱/۱					
	خرچ	معماللعہ ۹/۱۰/۱	سماعہ ۷/۵/۱					
	باقی	موعہ ۹/۱۰/۱	مالوعہ ۱۱/۵/۱					

مبلغ الالعہ ۳/۳/۸ سکہ عثمانیہ کے الماعہ کلدار لئے گئے۔

فہرست کتب

(سلسلۂ انجمن ترقی اردو)

البیرونی

کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ تعریف سے مستغنی ہے دسویں صدی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے ہندوستان آیا اور ہندوستان کے فلسفہ، تاریخ اور مذہب و معاشرت پر ایک بے مثل کتاب لکھی البیرونی اس کے حالات زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے۔ قیمت مجلد .. " .. ۸ر

فلسفہ اجتماع

تالیف ہے اور اس کا موضوع نفس اجتماعی یعنی جماعت کے اعمال و قوائے دماغی کی تحلیل و تشریح ہے موجودہ انقلابات میں اس کا مطالعہ دلچسپی اور فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس پر انگلستان و ہند کے علما و اخبارات نے اچھے اچھے ریویو لکھے ہیں۔

قیمت .. .. ایک روپیہ

قاعدہ و کلید قاعدہ

مدت کے غور و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات بمبئی نے اپنے صوبہ کے گورنر سے تحریک کی ہے کہ اس قاعدہ کو نصاب میں داخل کیا جائے جن اصول اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیئے۔ ان کی تشریح کے لئے ایک کلید بھی تیار کی ہے۔ قاعدہ ۲ر کلید قاعدہ ۴ر

دریائے لطافت

ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اردو صرف و نحو اور محاورات و الفاظ کی پہلی کتاب ہے اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں

قیمت . . . ایک روپیہ چار آنے

طبقات الارض

اس فن کی پہلی کتاب ہے۔ تین سو صفحوں میں تقریباً

جملہ مسائل قلمبند ہیں انگریزی اور اردو دانوں دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت ۸ عہ

مشاہیر یونان و روما

پلوٹارک لائوز کا ترجمہ ہے سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہے ادبیان عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہے وطن پرستی و بےنفسی، عزم و جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ لبریز ہے ہماری قوم کے ہر نوجوان کے ہاتھ میں اس کا ایک نسخہ ضرور رہنا چاہیئے۔ دنیا کی تمام مہذب زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ جلد اول غیر مجلد ۸؍ جلد دوم مجلد ۸؍

اسباق نحو

دو حصے ملک کے ادیب کامل مولانا مولوی حمیدالدین صاحب بی اے کی تالیف ہیں۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے عربی خواں طلبہ کے لئے نادر تحفے ہیں قیمت فی رسالہ ۴؍

علم المعیشت

اسرار تمدن کے سمجھنے کے لئے اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب ایم اے نے ملک پر بڑا احسان کیا ہے۔ حجم (۸۲۵) صفحے قیمت صرف چار روپئے للعہ

تاریخ اخلاق یورپ

اصل مصنف لیکی کا نام علم و تبحر تحقیق و صداقت کا مرادف ہے یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن و معاشرت اصول اخلاق مذہب و خیالات کا مرقع ہے۔ ترجمہ مولوی عبدالماجد صاحب بی اے حصہ اول مجلد ۸؍ حصہ دوم مجلد ۸؍

مبادی سائنس

فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہے اس کا بیان سلیس اور مقبول عام ہے اردو ترجمہ صرف ایک حصہ کا ہے اور آخر کتاب میں فرہنگ مصطلحات بھی ہے قیمت ... ... عہ

تاریخ یونان قدیم

یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ، اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندی ہے۔ ایف اے کلاس کے طلباء جو یونان قدیم کی تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجے مفید پائیں گے۔ مجلد قیمت ... ... عہ

انتخاب کلام میر

میر تقی سرتاج شعراء اردو کے کلام کا انتخاب ہے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو نے یہ انتخاب

ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے اور شروع میں مصنف صاحب
کی خصوصیات شاعری پر ۲۴۰ صفحے کا ایک مقدمہ
بھی ہے۔ قیمت ... ... عہ

رسالہ نباتات

اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی
اصطلاحات سے معرا۔ سلاست
روانی سے مملو اور دلچسپ و مفید ہے۔ طلبا، نباتات جس مسئلہ کو
انگریزی میں نہ سمجھ سکیں وہ اسی رسالہ میں مطالعہ کریں۔
قیمت مجلد ۸عہ

دیباچہ صحت

اس کتاب میں مطالبات صحت
مثلاً ہوا، پانی، غذا، لباس
وغیرہ پر مبسوط اور دلچسپ بحث کی گئی ہے زبان عام فہم
اور پیرایہ موثر و دل پذیر ہے۔ ملک کی بہترین تصنیف ہے
اس کا مطالعہ طبیبوں کے کئی ہزار نسخوں سے زیادہ قیمتی
ثابت ہوگا۔ حجم (۵۵۰) صفحے مجلد قیمت ... ... للعہ

قواعد اردو

ارباب فن کا اتفاق ہے کہ اردو زبان
میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھی گئی
بسیط و شرح کے علاوہ اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی
قواعد کا تتبع نہیں کیا گیا ہے۔ اس کو ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم
بمبئی نے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے قیمت عا

القول الاظہر

ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف
الفوز الاصغر کا اردو ترجمہ ہے
ابن مسکویہ آسمان علم و فضل کا آفتاب تھا یہ کتاب فلسفہ آئین
کے اصول پر لکھی گئی ہے اور مذہب اسلام پر انھیں اصول کو
منطبق کیا گیا ہے اس کو بمبئی یونیورسٹی نے سرکاری کتب خانوں
کے لئے تجویز کیا ہے۔ قیمت ... ... عہ

امرائے ہنود

پانسو سے زیادہ ہندو امراے کے
حالات قلمبند ہیں۔ یہ امرا سلاطین
مغلیہ کے زمانے میں بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے
کتاب گویا ان متعصب اور ناواقف مورخوں کا جواب ہے جو
اسلامی حکومت پر تعصب کا الزام لگاتے ہیں۔
قیمت حصہ اول عا حصہ دوم ۸عہ

القمر

قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی حرکات
اور چاند کے متعلق قطعی جدید انکشافات
ہوئے ہیں ان سب کو جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور
کتاب ایک نعمت ہے قیمت ۸ر

تاریخ تمدن

بکل کی شہرۂ آفاق
کتاب کا ترجمہ ہے الف سے یے
تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت سے بحث کی گئی ہے

ہر بحث کے لئے ایک عجیب دلکش پرمزہ طرز و اصول اختیار کیا گیا ہے اور
ہر اصول کی تائید میں تاریخی انتقاد سے کام لیا گیا ہے اس کے
مطالعہ سے معلومات میں انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا
ہوتی ہے۔ بمبئی میں سرکاری لائبریریوں کے لئے تجویز
کی گئی ہے۔ قیمت حصہ اول غیر مجلد عہ حصہ دوم مجلد عار

مقدمات الطبیعات

یہ ترجمہ ہے انگلستان کے
مشہور سائنس داں حکیم ہکسلی کی
کتاب کا ترجمہ ہے جسکا نام کتاب کی کافی ضمانت ہے۔ اس میں مظاہر
فطرت کی بحث درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے متعلمان
سائنس اور عام شائقین کے لئے بہت مفید ہے قیمت ۸ر

فلسفۂ جذبات

کتاب کا مصنف ہندوستان کا
مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ
نفس کی ہر ایک کیفیت پر نہایت لیاقت اور زباں آوری کے
ساتھ بحث کی گئی ہے۔ متعلمان نفسیات اسے نہایت مفید
پائیں گے قیمت مجلد عا۸ر

نکات الشعرا

یہ اردو شعرا کا تذکرہ میر تقی میر کی
تالیفات سے ہے اس میں میر صاحب
کی رائے اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل
ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے اس پر ایک
ناقدانہ اور دلچسپ مقدمہ لکھا ہے قیمت ے ر

نپولین اعظم

ایبٹ کی مستند کتاب کا اردو ترجمہ ہے
کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ نپولین
کی زندگی بشری جد و جہد کا آخری باب ہے۔ واقعات کی
داد یا تو سکندر کی زبان ادا کر سکتی ہے یا تیمور کی زبان، ترجمہ
آسان اور عام فہم ہے مکمل پانچ جلد قیمت . . . عے ر

فلسفۂ تعلیم

ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور
مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ غور و
فکر کا بہترین کارنامہ اور والدین و معلم کے لئے چراغ ہدایت ہے
تربیت کے زبانی قوانین کو اس قدر صحت کے ساتھ مرتب
کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہے اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔
قیمت . . . . ے ر

رہنمایان ہند

مشہور کتاب ہیروز آف انڈیا کا ترجمہ ہے
شروع میں ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد
کا بیان فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے اس کے بعد سری
کرشن جی مہاراج کی سوانح اور گوتم بدھ کے پر اثر حالات آتے
ہیں آخری حصہ میں شنکر اچاریہ رامانج اور رامانند کا ذکر ہے قیمت عہ

آنریری سکریٹری، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)